

”خضریٰ! کیا بات ہے بٹی۔ کل رات سے دیکھ رہی ہوں، بہت پریشان دکھائی دے رہی ہو۔“

”کوئی بات نہیں ہے انا بی! آفس میں آج کل کام بہت بڑھ گیا ہے اور.....“ اُس نے دانستہ کوئی بات ہونوں سے باہر نکلنے سے روکی تھی۔

”اور کیا؟ کیا چھپانے کی کوشش کر رہی ہو؟ کیا بات ہے؟“ انا بی چائے کا گنگ میل پر رکھ کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر متفکر لہجے میں گویا ہوئیں۔

”میرے ساتھ یہی تو مسئلہ ہے کہ آپ سے کوئی پرابلم چھپانا بھی چاہوں تو نہیں چھپا سکتی۔“

”اپنوں سے پریشانیاں چھپانا، ان کی محبتوں اور خلوص پر بے اعتمادی ظاہر کرتا ہے بیٹی۔ اور پھر میرا تمہارے سوا اور تمہارا میرے علاوہ کون ہے سوائے اللہ کی ذات کے۔ اگر ہم ایک دوسرے کو اپنی پریشانیوں اور مسرتوں سے باخبر نہیں رکھیں گے تو گھٹ گھٹ کر مر جائیں گے۔“

”کل بڑے سرفارن ٹور پر لمبے عرصے کے لئے چلے گئے ہیں اور ان کے پیچھے آفس کا سارا سسٹم ان کے اکلوتے بیٹے شانزل خان کے کنٹرول میں آ گیا ہے۔ آج سے تمام آفسز وہی کنٹرول کرے گا۔“ از حد تنگرو پریشانی خضریٰ کے چہرے اور لہجے سے عیاں تھی۔

”بہت سخت مزاج کا ہے کیا وہ لڑکا؟“

”سخت مزاج نہیں بلکہ بہت رنگین مزاج کا مالک ہے۔ از حد بد فطرت اور عیاش۔“

”تمہیں اس کے مزاج سے کیا لینا بیٹی، جو تمہارا کام ہے اس پر ہی دھیان دینا۔“

”شانزل گروپ آف انڈسٹریز میں مجھے کام کرتے ہوئے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ بڑے سر تو صرف کام سے کام رکھنے والے بندے تھے۔ ثانیہ بتا رہی تھی پچھلے سال بھی شانزل خان بڑے سر کے بزنس ٹور پر جانے کے بعد آفس آنے لگا تھا اور اس نے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے آفس کے تمام پورٹرنٹس میں رنگینیاں پھیلا دی تھیں۔ اور بھی بہت کچھ اس کے بارے میں ثانیہ نے بتایا ہے۔ میرا تو کل سے برا حال ہے، یہی سوچ کر کہ میں کس طرح فیس کروں گی اس شخص کو۔ یہ جاب کتنی پریشانیوں کے بعد ملی ہے پھر یہاں تنخواہ بھی خاصی مناسب ہے۔ اگر کہیں اور اچھی جاب ملنے کا ذرا بھی چانس ہوتا یا ہمیں جاب کی اتنی سخت ضرورت نہیں ہوتی تو میں کل ہی چھوڑ کر آ جاتی۔“

”اچھے اور برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے، تم اس قدر گھبرا کیوں رہی ہو؟ جن لڑکیوں کو مجبوریاں گھر سے باہر قدم نکالنے پر مجبور کرتی ہیں وہاں اتنا حوصلہ و جرأت بھی بخشتی ہیں کہ وہ آگے آنے والی ہر مصیبت و پریشانی کا مقابلہ کر سکیں۔ یقین رکھو عورت اگر موسم سے زیادہ نرم ہے تو فولاد سے زیادہ سخت بھی ہے۔ مرد لاکھ ضدی، جھٹ دھرم، طاقتور اور عیاش سہی، مگر اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرنے والی اور فولادی عزم رکھنے والی عورت کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتا۔ مرد جب عورت کی طرف بڑھتا ہے تو عورت کی رضامندی ہوتی ہے۔ ورنہ کسی مرد کو اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ عورت پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد دوسری ڈال سکے۔ اپنے اندر اعتماد پیدا کرو۔“

انابی کی باتوں نے خاصی ہمت و جرأت پیدا کر دی تھی۔ وہ یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی کہ وہ خود کو اس قدر نمایاں کرے گی کہ اس کی نگاہوں کا مرکز بنے اور نہ ہی اس قدر سنجیدگی سے کام کرے گی جو وہ بلاوجہ اس کی طرف متوجہ ہو۔

فیصلہ کرنے کے بعد تمام ٹینشن اور کنفیوژن سے آزاد ہو کر وہ بالکل ریٹیکس ہو کر کام کر رہی تھی۔ ثانیہ حسب عادت گھر لو پریشانیاں ڈسکس کر رہی تھی۔ وہ کمپیوٹر مانیٹر پر نگاہیں جمائے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔

”ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔ سرائی تک نہیں آئے۔ اس ٹائم تک ہمارا آدھا کام ختم چکا ہوتا ہے۔“ اس نے کمپیوٹر آف کرتے ہوئے حیرانی سے کہا۔

اسی دم گیٹ کھلا اور براؤن پیٹ کوٹ میں ملیوں وہ دروازہ قامت شخص دکھش مسکراہٹ کی روشنیاں بکھیرتا ہوا اندر داخل ہوا تو تمام اسٹاف باس کے احترام میں اسٹینڈ اپ ہو گیا۔ وہ بھی ثانیہ کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہی وہ ”شاہکار“ ہے جس کا انتظار تھا۔ سب کے سلام کا جواب دیتا ہوا وہ اپنے روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”ایسے ہی موقع پر کہا جاتا ہے کہ نام لیا اور شیطان حاضر۔“ ثانیہ مسکرا کر یولی۔

ثانیہ کے ریمارکس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کی بورڈ پر اس کی انگلیاں تیزی سے چل رہی تھیں اور ذہن میں سوچوں کے انبار تھے۔ بظاہر تو اس شخص میں ایسا کوئی تاثر نظر نہیں آیا تھا جس سے اس کی بدکرداری کی کوئی رمت ملتی۔ بلکہ بڑے سر کی نسبت وہ کچھ بہتر ہی لگتا تھا جو بہت خوشدلی سے سب کے سلام کا جواب مع مسکراہٹ کے دے کر گیا تھا۔

”خضریٰ بی بی، کسی کے بارے میں رائے قائم کرنے میں اتنی جلد بازی سے کام نہیں لیا کرو۔ کل ثانیہ سے اس کے بارے میں سن کر وہ اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ ساری رات اور صبح خوف و پریشانی میں گزاری تھی۔ اور اب ایک نگاہ میں اس کی ظاہری شرافت و شانگی سے نظریں متاثر ہو گئیں۔“ اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی اور مکمل توجہ مانیٹر پر مرکوز کر دی۔

”آگئیں بیٹی! کیا لگا باس؟“ انابی جو گیٹ کے قریب ٹہل رہی تھیں، اس کے سلام کا جواب دے کر بیٹھاری سے گویا ہو گئیں۔

”میں اسی لئے آپ کو بتانا نہیں چاہ رہی تھی کہ میری غیر موجودگی میں آپ کا سارا وقت فکر مند ہوتے اور ذخائیں مانگتے گزرا ہوگا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ان کے گلے میں بانٹیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”باس دیکھنے میں تو ویسا ہی ہے جیسے کروڑ پتی گھرانوں کے اٹھتے لڑکے ہوتے ہیں۔ افکار و انتشار سے پاک زندگی، بہترین غذا اور زندگی کی تمام آسائشوں کی دستیابی جنہیں حسن، خوبصورتی اور حد درجہ اعتماد و طمانیت اور آسودگی بخشی ہے۔ وہ بھی ایسا ہی ہے۔ لیکن بظاہر ملنسار اور شریف لگ رہا ہے۔ مگر عموماً ایسا ہوتا ہے کہ لوگ جس طرح نظر آتے ہیں، ویسے ہوتے نہیں۔“

”اللہ کا شکر ہے، میری دعا مستجاب ہوئی اور آئندہ بھی اللہ کرم کرے گا۔ چلو آؤ میں نے آج چائے کے ساتھ پکڑے بنائے ہیں اور ساتھ ٹائڈ کی پٹنی بھی بنائی ہے۔“ وہ خاصی مطمئن سی اُس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئیں۔ خضریٰ کپڑے پہننے کرنے روم کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے میں صوفے کے پاس رکھی ٹیبل پر پکڑے کھانے میں مصروف تھی۔

”اپنے اوپر اعتماد رکھو۔ اگر آپ اچھے ہیں تو دوسرے کی برائی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“

”انابی! آج کے وقت میں یہ فلسفہ کامیابی کی سند نہیں پاسکتا۔ اس دور میں ہم جن سے بچ کر چلنا چاہتے ہیں، وہی ہماری راہ کی بھاری رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔“

”ہمت نہیں ہارتے بیٹی۔“ انابی نے بھاپ اڑاتا ہوا چائے کا گگ اس کے آگے رکھتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کرائے دار نے کرایا دیا؟ فیاض آنے ہی والا ہوگا۔“

”کئی بار تھا خاڑا کر چکی ہوں۔ انہوں نے کل کا کہا ہے۔ دراصل بیٹی آج کل کے حالات تو دیکھ ہی رہی ہو، پہلے پڑوسی ملک پر امریکی حملے کے باعث ہماری معیشت پر کتنا اثر پڑا اور ابھی اس بحران سے نکلے بھی نہ تھے کہ دشمن ملک کے جنگی جنون نے اور زیادہ کاروبار پر برے اثرات ڈالے ہیں۔ ہر جگہ ایک افراتفری و اضطراب کی کیفیت ہے۔ ایسے میں وہ مجبور لوگ کہاں سے روزی کمائیں جو صبح سے شام تک کما کر لاتے ہیں تو گھر کا چولہا جل رہا ہے۔ اور ہمارے ملک میں تو کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو روز

کنواں کھودتے ہیں اور پانی پیٹتے ہیں۔ آئے دن بیروزگاری سے جگ آ کر خودکشی کرنے والوں کی خبروں سے اخبارات بھرے ہوتے ہیں، ایسا ہی ہوتا آیا ہے ہر دور میں۔ غریب، غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور امیر، امیر ترین۔“

”نہ معلوم کب ہمارے ملک میں خوشحالی آئے گی اور کرپٹ اور بے ضمیر لوگوں سے عوام کی جان چھوٹے گی۔ ہو شر یا بریگی نے ہم جیسے لوگوں سے زندگی کا حسن چھین لیا ہے۔ ہر آنے والا دن فکر اور پریشانیوں کا سورج طلوع کرتا ہوا ابھرتا ہے۔“ اُس نے گگ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے دگر فٹ لہجے میں کہا۔ انابی اُس کے گردش معاش میں جکڑے چہرے کو دیکھ کر طویل سی رہ گئی تھیں۔

”رات کو کیا کپے گا؟“ وہ ان کو افسردہ دیکھ کر تیزی سے موڈ بدل کر گویا ہوئی۔

”کل کا سالن، چنے کی دال گوشت خاصا بچا ہوا تھا۔ میں نے اس میں دو آلو بال کر ڈال کر چپس لیا۔ ٹھیک ٹھاک شامی کباب کا مصالحہ تیار ہو گیا ہے، ہر مصالحہ ڈال کر کباب تیار کر کے رکھ دیئے ہیں۔ کھاتے وقت فرائی کر لیں گے، تب ہی تھوڑی سی سلاڈ اور رائیہ بٹالوں کی اور شامی کبابوں کے ساتھ پرائیڈے اچھے لگتے ہیں، وہ بٹالوں کی۔“

”واہ! اس کو کہتے ہیں ٹوان ون۔ کل دال گوشت آج وہ بن گئے شامی کباب اور کل میں بٹالوں کی، دن ان تھری، یعنی کل دال گوشت، آج شامی کباب پچرائے اور کل آفس کے لئے میں اس کے سینڈوچ بٹالوں کی۔“ اُس نے ہنستے ہوئے کہا تو انابی بھی مسکراتے لگیں۔

”آپ نے مجھے بلایا سر؟“ اُس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اندر قدم رکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”ہیس، پلیز سٹ ڈاؤن۔“ شانزل خان نے آگے رکھی فائل سامعہ میں کھسکاتے ہوئے سامنے رکھی چیئر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”جھینکس سر۔“

پانچ منٹ گزر چکے تھے اور وہ بالکل خاموش تھا۔ خضریٰ کو کنفیوژن ہونے لگی تھی۔ آخر اس کی خاموشی بلاوجہ تو نہ ہوگی۔ اس کی گہری نگاہوں کا حصار وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔

ایک ہفتہ ہوا تھا اُسے آفس جوائن کئے ہوئے اور اس ایک ہفتے میں تمام اسٹاف میں یہ واحد لڑکی ایسی تھی جو اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ اس کا رویہ اتنا محتاط و خشک ہوتا تھا کہ اس جیسے سر پھرے اور مشکل پسند بندے کی نگاہوں میں آگئی تھی۔

”آپ نے مجھے کیوں بلایا تھا سر؟“ بالآخر دس منٹ گزر جانے کے بعد اسے پوچھنا پڑا۔

”آپ مجھ سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہیں؟“ بہت اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر لفظ ادا کئے گئے۔

”مم..... میں آپ سے خوفزدہ کیوں ہوگی سر۔“ اس کی صاف گوئی اُسے لمحے بھر کو یوگلا گئی تھی۔ وہ شاید انسانی رویوں کا بہت گہرائی سے تجزیہ کرنے کا ماہر تھا۔

”یہی تو میں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا رویہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہے؟ مجھے دیکھ کر آپ کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرتے ہیں جیسے کسی گھٹیا ترین غنڈے، بد معاش کو دیکھ کر انسان خود کو اس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہاں آفس میں بھی آپ فائنلر چپک کر دوا کر اس طرح بھاگتی ہیں جیسے مجھے کوئی خطرناک بیماری ہو جس کے جراثیم آپ کو لگ جانے کا خطرہ ہو۔ میں آپ کو آگاہ کر رہا ہوں کہ نہ مجھے کوئی بیماری ہے اور نہ ہی میرا فیملی بیک گراؤ کسی بد معاش سے وابستہ ہے۔“ اس نے خاصے خشک لہجے میں لفظ چبا چبا کر ادا کئے تھے۔

”آپ کو غلط فہمی ہے سر۔ میں بھلا کیوں یہ سب سوچوں گی۔ میں ایک بے حد معمولی سی ورکر ہوں، آپ کو میرے محسوسات کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔“

”میں آپ کو بریف کر دیتا ہوں کہ میرا اور ڈیڈ کے کام کرنے کا اسٹائل قطعی مختلف ہے۔ میں اسسٹنٹ سے وائس مین تک کی پروا کرتا ہوں۔ میری نگاہ میں محنت سے کام

کرنے والے ورکرز سب قابل احترام و اہم ہیں، کوئی معمولی نہیں۔“ اس کا نرم لہجہ شائستہ اور مہذبانہ تھا مگر آنکھوں سے نکلتی تپش اُسے سر جھکانے پر مجبور کر رہی تھی۔

”یہ فائل ہے آپ کی، اس میں تمام کوائف درج ہیں۔ بہت حیرت ہو رہی ہے مجھے یہ جان کر کہ آپ میری ڈیپٹی ہیں۔ اس کے باوجود اس قدر محتاط و گریز پارو یہ حیران کن ہے۔ اب تو پچکرز گرلز بھی خاصی انڈیپنڈنٹ اینڈ ماڈ ہو گئی ہیں۔“ نامعلوم کب تک اس کا فضول ٹاپک چلا کہ اس کی گرل فرینڈ کے آجانے کے باعث اس کی خلاصی ہوئی۔

”ہائے ڈیزائری ہو؟“ یو پیٹ، بلیک سیلوٹس شرٹ میں بلیوس ڈارک میک اپ میں اُس کا حسن دمک رہا تھا۔ بڑے والہانہ انداز میں وہ شانزل خان کے شانے سے لگی ہوئی پوچھ رہی تھی۔ ہاس نے خضریٰ کو جانے کا اشارہ کیا اور فق چہرہ لئے وہ لمحے بھر میں وہاں سے اپنے کیمین میں لوٹ آئی۔

”ارے..... کیا ہوا؟“ ثانیہ نے حیرت سے اُسے بدحواس سادیکھ کر حیرانی سے کہا۔ ”لا حول و لا قوہ، جو سین کبھی فلموں میں دیکھے تھے، اب وہ حقیقت میں دیکھنے کو ملیں گے۔“ اُس نے ثانیہ کو تمام باتیں گول کر کے شانزل خان اور اُس کی فرینڈ کے ملنے کا انداز بتایا تو وہ بے اختیار ہنس کر پڑی۔

”میری جان! یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارے سر تو بہت اوپن مائنڈڈ ہیں۔ وہ اپنی گرل فرینڈز سے کوئی فاصلہ رکھ کر ملنے کے عادی نہیں ہیں۔ پچھلی مرتبہ جب آئے تھے تو یہاں ریسپشن پر شرمیلا سنگھ ایک غیر مسلم لڑکی تھی، انکو کیڈ تو زیادہ سنہ تھی مگر حسین بلا کی تھی۔ سرنے پہلے دن اسے دیکھا اور دوسرے دن وہ ڈائریکٹ ان کی پرسنل سیکرٹری کی سیٹ پر تھی اور پھر وہ تھے اور سیکرٹری صاحبہ۔ گھنٹوں وہ ان کے ساتھ آفس میں گزارتی تھی اور کسی کو آؤٹر نہ تھا کہ پرمیشن کے بغیر وہاں چلا جائے۔ شرمیلا کے ساتھ سر کا انفر چھ سات ہفتے چلا، وہ شروع شروع میں بہت عام سے ملبوسات میں آتی تھی مگر سر کی رفاقت نے تو اس کی تقدیر ہی بدل ڈالی۔ وہ راتوں رات فرش سے عرش پر جا پہنچی۔ اُس نے کارلی، ہنگے علاقے میں کوٹھی خریدی اور بہت غماٹ سے رہنے لگی تھی۔ سر کے ساتھ

چہنچہتے۔ اپنے اندر چیخ لاؤ، ارد گرد سے باخبر رہا کرو اور کچھ میگزینز وغیرہ بھی پڑھ لیا کرو۔
سر جھکا کر آنا اور سر جھکا کر جانا ترک کر دو بلکہ سر اٹھا کر چلا کرو۔“

”اوکے مائی لاڑو۔ اگر آپ کے احکامات نمائشوروں کی فہرست ختم ہو گئی ہو تو میں
اپنا کام شروع کروں؟“ خفنی مسکرا کر بولی تو ثانیہ ہنس پڑی۔

”اب سکون سے کام کریں گے۔ دیکھو سر اب کبوتری کے ساتھ اڑ رہے ہیں اور
بھئی ان بڑے لوگوں کے بھی بڑے ہی مزے ہیں۔“ ثانیہ نے شیشے کے پاد کو پڈور
سے لٹٹ روم کی طرف جاتے ہوئے شانزل خان اور ماڈل سیٹر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

گھر میں قدم رکھتے ہی سارے دن کی تھکن مزید بڑھ گئی جب اس نے بڑے
اطمینان سے رافع فیاض کو انابی کے تخت پر دراز پایا۔

”اوہ! آجھی تم، جیسی کہوں یہ روشنی کیوں ہر جگہ بھیل گئی ہے، فضا میں خوشبو کی بکھر گئی
ہیں۔ ماحول۔۔۔۔۔“

”پلیز اسٹاپ اٹ۔ مجھے نہیں سنی یہ تمہاری فضول بکواس۔ انابی! یہ آدمی یہاں
کیوں ہے؟ آپ نے اس کا حساب کیوں نہیں کیا؟“ ترش لہجے میں رافع سے مخاطب
ہو کر وہ انابی سے بولی۔ وہ کچن سے برآمد ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھ آٹے میں سنبے
ہوئے تھے۔

”بیٹی، کرائے دار کا کام نہیں ہے۔ دو ہفتے ہو گئے اس کی ملازمت ختم ہوئے۔ وہ خود
نیوی بیچوں کے ساتھ قاتے کر رہا ہے۔ اسے ہیٹ بھرنے کو نہیں ہے، بے چارے کرایہ
کہاں سے دیں۔“

”واہ، کنگلوں سے کنگے ہی نکراتے ہیں، کیا کریں بھی۔۔۔۔۔“
”شٹ اپ، بہتر یہی ہو گا، یہاں سے تم دفع ہو جاؤ۔ تم جیسے ذلیل آدمی کی مکروہ
شکل دیکھتے ہوئے بھی ٹھن آتی ہے۔“ وہ اس کی بات قطع کر کے نفرت انگیز لہجے میں
غرائی تھی۔

کئی ہفتے وہ شمالی علاقوں میں بھی گزرا کر آئی۔ پھر سر کی نگاہ انتخاب بڑے آفس کے
سیکرٹری کی اسٹنٹ پر پڑی۔ روحیلہ مسعود سے دوستی کا آغاز ہوا تو شرمیلا سنگھ کو ذرا پ
کر دیا گیا۔ لیکن اس مدت میں شرمیلا نے اتنا چیک بیٹنس بنا لیا کہ نہ صرف کار، کوشی کی
مالک بن بیٹھی بلکہ اس نے ایک پوش علاقے میں بہت جدید انداز میں بیوٹی پارلر کے
ساتھ سلنگ سینٹر کھول لیا۔ اب وہ یہاں سے ریڈائن کر کے پارلر اور سینٹر چلا رہی ہے۔
روحیلہ مسعود سے بھی سر کی دوستی اسی طرح ہر حد کو پار کرتی ہوئی چند ہفتے قائم رہی اور اس
نے بھی دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ لی اور سر کی توجہ اگلے شکار کی طرف مرکوز ہوتے
ہی وہ ملک سے باہر جا کر سیٹل ہو گئی۔ سر کے شکاروں کی لسٹ بہت طویل ہے اور اس
میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ کسی بھی لڑکی کو زبردستی حاصل نہیں کرتے۔ لڑکیاں پنڈ
سم، فرنگ پرستانی اور پھر دولت پر دل و جان سے مرنی ہیں اور سر چند ہفتوں سے
زیادہ کسی کو برداشت نہیں کرتے۔ لیکن لڑکیاں بہت قلیل عرصے میں دولت اور مہنگے ترین
تختے سمیٹ کر شاندار مستقبل بنا لیتی ہیں۔“ ثانیہ نے چائپ رائٹر کی جانب متوجہ ہونے
سے قبل تمام باتیں گویا اس کے گوش گزار کر دی تھیں۔

”تمہاری معلومات میں اور اضافہ کروں، یہ جو مہتمم ابھی آفس میں آئی ہیں، یہ غیر
ملکی چائپ کی ماڈل ہے، بلکہ گزشتہ سال کی مس یونیورس بھی ہے اور سنا ہے سر کی دوستی
اس سے کچھ زیادہ ہی ”گہری“ ہے۔“ ثانیہ دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔ ثانیہ کا
بہترین مشغلہ تھا یہ۔ اسے دوسروں کے متعلق باتیں کرنے کا جنون تھا۔

”بائی گاڈ، چھوڑو اس قہقہے کو۔ ہمیں صرف اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے۔ فضول
میں کیوں دوسروں کے بارے میں تجسس رہیں۔“ اس نے سنجیدگی سے موضوع بدلنا
چاہا۔

”تم میں نہ معلوم کون سی بوڑھی اور دنیا سے بیزار روح سمائی ہوئی ہے میری جان!
سچوے کی طرح اپنے خول میں بند رہتا چھوڑو، آپ دنیا سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر
سکتیں۔ بے ضرر اور بے وقوف لوگ اس دور میں ٹھو کریں کھاتے ہیں، کبھی منزل پر نہیں

”اب کیا کریں؟ محروہ ہوں یا ممنوع، آدمی تمہارا ہی تو ہوں۔ تم نہ مانو یہ الگ۔۔۔۔۔“

”ارے میاں! کیوں پریشان کرتے ہو۔ بچی پہلے ہی تمہی باری آفس سے آئی ہے، اوپر سے تم بیک بیک کرو رہے ہو۔ جب کہہ دیا پیسے کچھ دن بعد آ کر لے جانا تو پھر جاؤ۔“

انابی خضریٰ کی مشتعل کیفیت دیکھ کر جلدی سے بولیں۔

”میں پچھلے ماہ سے یہ کچھ دن کی گردان سن رہا ہوں، اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتا۔ مجھے سیدھی طرح سے میرا روپیہ چاہئے یا پھر اپنی لاڈلی سے کہیں چل کر میرے ساتھ رہے۔ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ اسے شہزادی بنا کر رکھوں گا۔ صبح شام بسوں کے دھکے کھا کھا کر جو اس کا روپ رنگ خراب ہو گیا ہے، ایک دم گلاب کے پھول کی مانند کھل جائے گا۔ یہ ایک دفعہ راضی تو ہو جائے میرے ساتھ رہنے کے لئے۔“ رافع فیاض نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے خضریٰ کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کر چکے ہو اس؟ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ میں ابھی رخسانہ کو فون کر کے بتا کر آتی ہوں کہ تم مجھے ساتھ لے جانے کے لئے تیار ہو۔“

”ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے میری رقم مل جانی چاہئے۔ ورنہ پھر مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

رخسانہ کی دھمکی آج بھی کارگر ثابت ہوئی اور وہ دھمکیاں دیتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

”منہ ہاتھ دھو لو بیٹی، میں اتنے میں گرم گرم پھلکے پکا کر لاتی ہوں۔ اسٹو بنایا ہے آج میں نے۔“

”نہیں، اب کھانا نہیں کھایا جائے گا مجھ سے۔ صرف ایک کپ چائے دے دیں۔“

باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے اس نے حسب توقع خاصے پڑ مردہ لچہ میں کہا تھا۔ اور جب تک وہ باتھ روم سے حلیہ درست کر کے کمرے میں آئی، تب تک انابی بکن سے فارغ ہو کر اس کے لئے بھاپ اڑاتا چائے کا گنگ نمبل پر رکھے بیٹھی تھیں۔

”بہت تھکی تھکی لگ رہی ہو۔ بہت کام تھا آج؟“

”کب سے آیا ہوا تھا وہ؟“

”ایک گھنٹہ ہوا تھا اسے آئے ہوئے۔“

”نہ معلوم کیوں ہم جیسے لوگوں کی مشکلات گزرتے وقت کے ساتھ دراز ہوتی جاتی ہیں۔ حراماں نفیسی دنگ دتی کے منھوں سائے شاید موت کی آغوش میں پہنچا کر ہی ساتھ چھوڑیں گے۔“ اس نے گگ سے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

”نا اُمیدی مسلمانوں کا شیعہ نہیں ہوتی بیٹی۔ رب کسی کو دے کر آزماتا ہے اور کسی کو ترسا کر۔ مگر بندے کی برداشت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ ہر رات کا سویرا ضرور ہوتا ہے۔ دکھوں کے بعد خوشیاں بھی رب کی طرف سے دامن بھر دیتی ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ دکھوں سے گھبراتے نہیں، ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد اس کی رحمت کی بارش ہم پر بھی برے گی۔“ اس کی افسردگی انابی کو ہمیشہ ہی لولول و افسردہ کر دیتی تھی اور خاص طور پر وہ رافع فیاض کے آنے کے بعد تو بہتوں پریشان رہتی تھیں۔ آج بھی وہ آیا تو انہوں نے لاکھ کوشش کی کہ وہ اس کے آنے سے پہلے چلا جائے مگر وہ بھی اپنے وقت کا ایک ڈھیٹ و بے حس آدمی تھا، جب تک خضریٰ کو جلا کر اس سے باتیں نہ سن لیتا، وہ جاتا ہی نہ تھا۔ اب انہیں معلوم تھا وہ ہمتوں پریشان رہے گی اور اس دوران کھانا پینا تو برائے نام ہی رہ جائے گا۔ اس کی فکر انہیں اپنی صحت سے زیادہ رہتی تھی۔

”انابی! رافع فیاض کے آنے سے قبل زندگی اتنی دشوار تو نہیں تھی، اس شخص کے سائے نے میری زندگی دھکی ہوئی دوزخ بنا ڈالی ہے۔ اس کی لالچی و حریص فطرت کو جانتی ہیں آپ، ایک ماہ اس نے نہ معلوم کس طرح صبر کیا ہے، اب ایک ہفتہ صبر کرنے والا نہیں ہے۔ وہ باہر گئی میں آ کر گدھے کی طرح چیخے گا اور لوگ نہ معلوم کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں۔ ایک عزت ہی تو ہم نے بنائی ہے زندگی میں۔ اگر وہ بھی چلی گئی تو سانسیں بند ہو جائیں گی۔ اور میں اس غبیث شخص کی قرض دار نہیں مرنے چاہتی۔“

”اللہ بڑا بادشاہ ہے، اس پر معاملہ چھوڑ دو، وہ خود حل کر دے گا۔“

”بے شک، اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے ہمارا۔ کرائے دار کی مکاریاں آپ سمجھ نہیں رہی ہیں۔ ابھی ایک ہفتہ قبل کلرٹی دی لایا ہے۔ کیا وہ ڈاکہ مار کر لایا ہے؟ جب اس کا کوئی کام نہیں ہے تو، اور صبح شام آپ کو اس کے بچن سے نت نئے کھانوں کی خوشبوئیں نہیں آتیں؟ کرایہ ادا کرنے کے لئے وہ فاقے مر رہا ہے۔ اتالی! لوگوں نے آج کل یہی ڈھونگ رچا رکھا ہے، سب کچھ ہوتے ہوئے بھی روتے رہتے ہیں، ہمارے پاس کچھ نہیں ہے، اپنی غرض پر منٹوں میں لاکھوں روپیہ اڑا دیتے ہیں۔ ان سے میں خود بات کروں گی۔“

”نہیں نہیں، تمہیں کسی کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بات کروں گی۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ بچے ضد کر رہے تھے تو بھائی کاٹی وی کچھ دنوں کے لئے لایا ہوں۔ اچھا کل اس کا چھوٹا والا بیٹا تمہیں یہی بتا رہا ہو گا۔ تو بہ تو بہ..... کیسے بے ایمان لوگ ہیں۔ ایسے لوگ سچے مصیبت زدہ لوگوں کا یقین بھی گنوا دیتے ہیں۔ بس تم بے فکر ہو جاؤ، اب میں خود چند دن نظر رکھوں گی، پھر خود نٹ لوں گی۔“

اس نے اتالی سے نظر ہچا کر وہ سونے کے جڑاؤنگن نکال لئے جو امی نے بہت محبت سے اس کے لئے بنوائے تھے، سلائی اور گھریلو ضروریات کم سے کم کر کے۔ انہیں معلوم تھا ان کی بیٹی کو عام لڑکیوں کی طرح بھاری جیوری پسند نہیں ہے، وہ صرف نازک سے ایئر رنگ اور ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں پہننے کی خواہش بھیچن سے ہی کرتی آئی تھی۔ انہوں نے روپیہ روپیہ جوڑ کر چار چوڑیاں اور دو جڑاؤنگن اس کی شادی کے لئے بنوائے تھے۔ چار چوڑیاں رافع فیاض کو وہ دے چکی تھی اور ان سنگٹوں کو اس نے بہت محبت و احتیاط سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ ان سے اسے ماں کی محبت اور خوشبو نکلتی محسوس ہوتی تھی۔ از حد چاہنے والی ماں کو اس کے صدمے نے ہی تو دوسرے جہان پہنچا دیا تھا۔ ماں کی مشقتوں سے بنائی گئی نشانی اسے دل و جان سے عزیز تر تھی۔ سنگٹوں کے چمکتے ٹکوں میں ماں کی ممتا، مجبوری و لاچارگی سب نظر آتا تھا۔ جب بھی ماں کی زیادہ یاد

آتی، وہ ان سنگٹوں کو نکال کر چومتی، انہیں سینے سے لگا کر تھنتوں بے خود ہو جاتی۔ اسے لگتا ماں کی آغوش نے اسے ڈھانپ لیا ہے اور وہ پرسکون ہو جاتی۔ اور اب مجبوری میں وہ انہیں فروخت کر کے رافع فیاض کی رقم دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ یہ واحد چیز تھی اس کے پاس فروخت کے لئے۔

وہ سنگٹن پرس میں ڈال کر آفس چلی آئی تھی۔ خاموشی اور عجیب گم مسمی کیفیت کا شکار ہو گئی تھی۔ سنگٹوں سے دلی و جذباتی طور پر وابستگی نے اسے مضطرب کر ڈالا تھا۔ شکر تھا کہ آج کانپہ کسی وجہ سے آفس نہیں آئی تھی ورنہ وہ ضرور اس کی کیفیت نوٹ کر کے خوب سوالات کرتی اور مطمئن کرنے کے لئے نہ معلوم اسے کون کون سے بہانے بتانے پڑتے کہ اپنی خود داری وانا اسے جان سے بڑھ کر عزیز تھے۔

”ایکسی کیڑی ایجنی پر اہلم؟“ شانزل خان کی آواز بہت قریب سے گونجی تھی۔
”سبس..... سر! آپ یہاں؟ مجھے بلا لیا ہوتا۔“ اسے اپنے بہت قریب کھڑا دیکھ کر وہ ہلکلا کر کھڑی ہو گئی۔

”میں دو مرتبہ یہاں سے گزرا ہوں اور ہر بار آپ کو پریشان اور اُداس دیکھا ہے بلکہ رنجیدہ اور افسردہ، ارد گرد سے قطعی بیگانہ، جیسے آپ کو کسی کی جدائی کا صدمہ ہو یا آپ جبراً کسی سے الگ ہو رہی ہوں۔“ وہ اپنے مخصوص دھیمے اور مسکور کن لہجے میں بول رہا تھا۔

تھنری اس کی قیافہ شناسی پر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ بلا کا ذہین اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ از حد خامیوں کے علاوہ چند خوبیاں بھی اس کی ذات میں موجود تھیں لیکن وہ اس کی بے باک آزاد فطرت کے نظارے دیکھ چکی تھی، اس لئے اس پر کسی قسم کا اعتبار کرنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ اس کا یوں کہیں میں بلاناک کئے آتا بھی اسے ناگوار گزرتا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں سر! آپ بتائیں، کیا کام ہے؟“
”میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے اور ڈیڈ کے کام کرنے کا انداز بالکل جدا ہے۔ مجھے عام ورکر سے واضح مین تک کی پروا اور فکر ہوتی ہے۔ اگر کوئی سیریس معاملہ

ہے تو آپ مجھ پر اعتبار کر سکتی ہیں۔ آپ کو مجھ سے مایوسی نہیں ہوگی۔“ اس نے فراخ دلانہ ہنسی کی۔

”تمہیں کس بہت مہربانی۔ میں اپنے مسائل پینڈل کرنا جانتی ہوں۔“

”گور، مجھے لڑکیوں میں یولڈنٹس بہت اچھی لگتی ہے۔ لیکن آپ اس وقت بھی مجھ سے خوفزدہ لگ رہی ہیں..... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“ اس نے بہت سکون سے کہا۔

”نوسر! یہ بات نہیں۔ آپ اس کہیں میں آئے ہیں، تمام اسٹاف کے لوگ مجھے عجیب نگاہوں سے چوری چوری دیکھ رہے ہیں۔ ان معنی خیز نگاہوں اور چہ میگوئیوں کی آپ کے نزدیک کوئی حقیقت نہ ہو مگر سر، میں ٹڈل کلاس فیل سے قطع رکھتی ہوں، جہاں لڑکیوں کے ساتھ ایسی نگاہیں، ایسی باتیں منسوب ہو جائیں تو انہیں عزت اور غیرت کے نام پر زندہ دفن کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔“

”اوکے..... اوکے۔ فکر کی کوئی بات نہیں، یہاں سب میری عادت سے واقف ہیں۔ میں ورکرز کے علاوہ وائچ مین کے کہیں میں بیٹھا ہوا اکثر لوگوں کو نظر آتا ہوں۔ اپنی دسے، میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ باس اور ورکرز کے درمیان فاصلے زیادہ نہ ہوں تو بہتر ہے۔ ورکرز جب ہم سے اپنے پراہمز شیئر کریں گے تو ہم ہیلپ کریں گے اور جب پراہمز حل ہوں گی تو ورکرز اپنا کام یکسوئی اور پرسکون انداز میں کر سکیں گے۔ اور جب کام وقت پر اور بہتر انداز میں مکمل ہوگا تو ہمیں اور ورکرز سب کو فائدہ ہوگا۔“ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

خطرہ کی خاموش رہی۔ وہ اس کی حاضر جوابی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بھی اسے اپنا کام دھیان سے کرنے کی تلقین کر کے چلا گیا تو گہرا سانس لے کر وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

”میں ہزار کے ٹکٹن آپ کس طرح پانچ ہزار میں خرید رہے ہیں؟“ اس نے شدید حیرانی سے ڈکاندار کی طرف دیکھ کر کہا تھا جس نے نہ معلوم کس کس چیز کو کاٹ کر حساب بنایا تھا۔

”بی بی! اس رسید پر میں نے سب لکھ دیا ہے۔ سونے کی رقم آپ کو دے رہے ہیں۔“

”کیا اتنا کم سود استعمال ہوا ہے ان میں؟ اور گنیے تو دیکھیں آپ، کتنے قیمتی اور بے حساب گلے ہوئے ہیں۔ کیا ان کی کوئی قیمت نہیں ہے؟“

”گنیوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ صرف سونے کی قیمت ہوتی ہے۔ ان دنوں تو سونے کے دام بھی گرے ہوئے ہیں۔ ان کڑوں میں سونے سے زیادہ کھوٹ ملا ہوا ہے۔“

”واہ! یہ اچھا انصاف ہے آپ لوگوں کا۔ جب ہم خریدتے ہیں تو کھوٹ، ٹانگوں، گنیوں سب کی قیمت آپ دگنی چوگنی وصول کرتے ہیں۔ اور جب آپ خریدتے ہیں تو صرف سونے کی قیمت دے دیتے ہیں، وہ بھی چوتھائی حصہ۔“ شدید ڈکھ اور غصے سے اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

”دیکھیں بی بی! اگر آپ کو انہیں فروخت کرنا ہے تو میں آپ کو صرف پانچ سو روپے بڑھا کر دے سکتا ہوں۔ اگر آپ کو سودا منظور ہے تو بولیں۔“ ڈکاندار نے کاروباری انداز میں کہا۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ کئی ڈکانداروں سے معلوم کر کے یہاں آئی تھی، کوئی بھی کاروبار مانع پڑنے کے باعث خریدنے کو تیار نہ تھا۔ یہ چوہدری شاپ شہر کی مشہور شاپ تھی۔ وہ یہ سوچ کر آئی تھی کہ یہاں ان کڑوں کی قیمت اچھی مل جائے گی۔ اب نہ معلوم اس کا وقت خراب تھا یا ڈکاندار اس کی مجبوری بھانپ گیا تھا جو سودا منی کے دام خرید رہا تھا۔

”بی بی! لے جائیں انہیں۔ مگر سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کر کے آئیے گا۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ گھنٹوں بیٹھے آپ کے فیصلے کا انتظار کریں۔ دوبارہ اگر آپ آئیں تو صرف پانچ ہزار ملیں گے، پانچ سو کی آخر ختم ہو جائے گی۔“ ڈکاندار نے تند انداز میں کہتے ہوئے ٹکٹن اس کی طرف بڑھا دیئے اور دوسرے کسٹمر کی جانب بڑھ گیا۔ اس سے بات کرتے وقت اس کا لہجہ اتنا تند و تحقیر آمیز تھا گویا وہ ٹکٹن فروخت کرنے نہیں، بھیک

خلوص کے روابط!

”جی..... میں اب یہ جاب برقرار نہیں رکھ سکتی۔“ اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
 ”اوکے، ایز یوش..... لیکن ہمارا ایک اصول ہے۔ ہم جہاں اپنے ورکرز کو بے
 حساب مراعات دیتے ہیں، وہاں ہم بلا سبب ریزائن کرنے والوں سے ہر جاب بھی لیتے
 ہیں۔ آپ یہ رقم دے دیجئے اور شوق سے ریزائن دے جائیے۔“ اُس نے ایک سلیپ
 آگے بڑھائی۔

”اتنی بڑی رقم، مائی گاڈ! یہ اصول نہیں، بے انسانی ہے۔ اور جاب دیتے وقت تو یہ
 اصول نہیں بتایا گیا تھا۔“ غصہ، رنج، تاسف اُس کی آواز اور چہرے سے عیاں تھے۔
 ”آپ نے اس وقت جاننے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی ہوگی۔“ اُس کے ٹھنڈے
 لہجے میں ٹھٹھکی کاٹ شامل تھی۔ خطرئی کو پورا کمرہ گھومتا ہوا لگ رہا تھا۔

”میں..... میں اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتی۔ کیا کوئی دوسرا اصول نہیں ہے؟“
 ”ہے۔ ہر ورکر کے لئے لازمی ہے کہ وہ ریزائن کرنے سے تین ماہ قبل آگاہ کرے
 تاکہ اتنے عرصے میں ہم نئے ورکر کو اپائنٹ کر سکیں۔ اگر آپ رقم نہیں دے سکتی ہیں تو
 پھر تین ماہ ویٹ کریں۔“

”لیکن میں یہاں ایک دن بھی جاب کرنا نہیں چاہتی اب۔“
 ”ہوں، یہاں جاب نہیں کریں گی تو آپ کو کہیں جاب کرنے نہیں دیا جائے گا اور
 آپ کمپنی کو ہر جاب ادا کئے بنا گھر بھی نہیں بیٹھ سکتیں۔“ اُس کا لہجہ سپاٹ مگر اٹل تھا۔
 ”آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟“
 ”جو آپ سمجھیں۔“

وہ سخت تذبذب کا شکار تھی۔ جاب کی اُسے سخت ترین ضرورت تھی۔ بلاشبہ یہاں
 سیلری زبردست تھی لیکن ملازمت کر نہیں سکتی تھی تو چھوڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ بہت کڑی
 شرط تھی، پھر دھمکی بھی۔ اور اتنا اثر و رسوخ والا بندہ واقعی اُسے کہیں جاب نہ ملنے دیتا۔
 ٹھیک ہے، تین ماہ جبراً جاب کر لوں گی۔ مگر شانزل خان، تمہیں بتا دوں گی کہ میں ان گھنیا
 اور حیا فروش لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جنہیں تم اپنی دولت سے زیر کرتے ہو۔

”مث اب، خوش ہوتے وقت تمہیں ذرا احساس نہیں کہ وہ شخص کس کیریکٹر کا
 مالک ہے اور تم جانتی ہو وہ بلاوجہ کسی پر مہربان نہیں ہوتا۔ میں ریزائن کر دوں گی۔ مجھ
 سے یہ گھنیا اور ذلیل جاب ہرگز نہیں ہوگی۔ شرمیلا، جعفر، روحیلہ یا مارگریٹ وغیرہ نہیں
 ہوں میں۔“

”میں نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ سرکسی کو زبردستی حاصل نہیں کرتے اور تم نے ہی تو
 کہا تھا کہ اگر عورت بکنا نہ چاہے تو دنیا کا کوئی بھی مرد اسے خرید نہیں سکتا۔“ غائب نے
 اس کی بات سے ہی اسے قائل کرنا چاہا مگر وہ خاموشی سے استغنیٰ ٹانپ کرتی رہی۔ اب
 وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک دیکھ چکی تھی جس چمک کو وہ کوئی
 نام تو نہ دے پائی تھی مگر اس کے لاشعور میں کچھ ہونے، کسی بڑی تباہ کن گڑبڑ ہونے کا
 ادراک جاگ اٹھا تھا۔ وہ شخص چہرے پر ہنسنے کا ماہر تھا اور کل یقیناً وہ اُس کی پریشانی
 بھانپ گیا تھا۔ جیسی بڑے اصرار سے کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی پریشانی ہے تو وہ مدد کرے گا۔
 اور اس کے انکار پر اُس کے چہرے پر ناگواری و ددھکی کے سائے لمحے بھر کو چھا کر
 غائب ہو گئے تھے۔

”اوہ، سر کی بات سن کر میں انٹرکام آف کرنا بھول گئی۔“ انٹرکام پر نگاہ پڑتے ہی
 چائے گھبرا کر بولی تھی۔ لیکن خطرئی کہیں سے جا چکی تھی۔

شانزل خان نے جھٹکے سے انٹرکام کا ریسیور چننا تھا۔ اُس کا دبیہ چہرہ غصے اور ضبط
 سے سرخ ہو رہا تھا، چند لمحے اُسے اپنی اضطرابی کیفیت پر کنٹرول کرنے میں لگے۔ اُس
 نے دل میں کوئی فیصلہ کیا اور اگلی ساعت وہ بالکل بر سکون تھا۔ جنون و اشتعال انگیزی
 بالکل غائب ہو گئی تھی۔

”آئی ایم کم این سر؟“ سامنے خطرئی نے آکر اجازت طلب کی اور اُس کے ”ایس“
 کہنے پر اندر آکر اپنا استغنیٰ اُس کے سامنے رکھ دیا۔

”ریزائن کر رہی ہیں آپ؟“ شانزل خان نے پیچہ کی جاب نگاہ ڈالے بنا خطرئی
 کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے چارل انداز میں کہا۔

روپے کی ادائیگی کبھی ہوئی تھی۔ میں خود حیران رہ گئی کہ اپنے ہاتھ سے میں ہزاروں روپیہ اسے پچھلے سال سے دے رہی ہوں۔ میں نے بہت کہا مگر وہ جھوٹا، مکار اور دغا باز ہے۔“

”آف..... آزمائش در آزمائش کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا؟ میں تھک گئی ہوں انا بی! مظلوم و مجبور حالات کے بے رحم چھیڑے کھاتی ہم جیسی لڑکیاں جن کے سر پر نہ باپ کی پناہ کی محبت ہے اور نہ بھائی کے تحفظ کا حصار، اس مردوں کے معاشرے میں رافع فیاض جیسے لالچی و فریبی، شانز دل خان جیسے ہوس پرست دولت اور ناجائز اختیارات کے زعم میں خود کو خدا سمجھنے والوں سے کس طرح بچ کر نکلا جائے کہ یہ لوگ ہر قدم پر مٹی کے ذروں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔“ بے بسی کے احساس سے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”روڈ نہیں میری بچی۔ اسے تم تو میرا سہارا ہو، میری اُمید و یقین کی روشنی۔ کوئی ماں اتنا غم تو اپنے درجن بھر بیٹوں پر نہیں کرتی جتنا مجھے تباہ کر رہا ہے۔ بنی! زندگی سیدھی سڑک کی مانند نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ایک ایسا راستہ ہے جہاں راہ میں خاردار بھی آئیں گے، کہیں فلک کو چھوتی ہوئی چوٹیاں، کہیں اندھی گہری کھائیاں اور سبزہ و خوشحالی بھی تمہاری راہ میں آئے گی۔ یہ سب شاہراہ حیات کے موڑ ہوتے ہیں۔ نا اُمیدی تو کفر ہے میری بچی۔“ انا بی نے اُسے سینے سے لگایا تو اُس کے اندر بھڑکنی آگ پر یکدم ہی شبنم کی نرم نرم پھواری گرنے لگی۔ رگ و پے میں آسودگی اور طمانیت سکون بن کر دوڑنے لگی۔ وہ کتنی ہی دیر معصوم سی بچی کی طرح ان کے سینے سے لگی رہی۔ سچ ہے، محبت اور اپنائیت کی مشاس صرف خون کے رشتوں میں ہی نہیں دوڑتی، بے غرض و بے لوث محبت خون کے رشتوں پر بھی حاوی ہو جاتی ہے۔

ایک ہفتہ ہو چکا تھا اُسے شانز دل خان کی ٹیکر ٹری کی سیٹ پر کام کرتے ہوئے۔ ان دنوں میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جس سے وہ خوفزدہ تھی۔ کام بھی ایسا کوئی خاص محنت طلب یا مشکل نہیں تھا۔ سارا دن اُس کے آفس سے ملحق شیشے کے کیبن میں بیٹھے

”مجھے کیا کام کرنا ہوگا؟“ اُس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔
”وہ..... میرے موڈ پر منحصر ہے۔“ اُس کی نگاہوں میں نا اطمینان چمک اور ہونٹوں پر گہری ششخراہ مسکراہٹ تھی۔ گویا کہہ رہا ہوتا تھی جلدی شکست تسلیم کر لی۔

”اللہ کی ماریاں کم سختوں اور جھوٹوں پر۔ پہلے تو جھوٹ بول کر گناہ کے خوف سے لوگ مہر جایا کرتے تھے، اب نا ہجارتوں کو چھینک تک نہیں آتی، گناہ کا تصور ذہنوں سے اس طرح مٹا ہے کہ گناہ کو گناہ سمجھتے ہی نہیں۔“

”کیا ہوا؟“ اُس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر انا بی کی طرف غور سے دیکھا۔
”آج گئی تھی میں رافع فیاض کو روپے دینے۔ کہنے لگا اس طرح کام نہیں چلے گا۔ میرا سارا روپیہ تم لوگ تو ذکر دے رہے ہو، اس طرح میرا بہت نقصان ہو رہا ہے۔ بس اب میرے میر کی حد ختم ہو گئی، دو ماہ کے اندر اندر اس کی رقم اسے مل جانی چاہئے۔ ورنہ..... وہ.....“ انا بی کو احساس ہوا کہ حضری کو سب سچ نہیں بتانا چاہئے۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان و فکر مند لگ رہی تھی۔

”ورنہ کیا کرے گا وہ؟ بتائیں انا بی۔“ وہ ایک دم متوجش سی کھڑی ہو گئی تھی۔
”ارے جھوڑو، وہ یونہی بکواس کرتا ہے۔ میں تمہارے لئے چائے لاؤں۔“
”نہیں۔ آپ بات پوری کریں، سچ بتائیں۔ کیونکہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ جھوٹ بولنے والے پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔“ اُس نے انہیں قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

”کیا کہے گا بد ذات اس کے علاوہ کہ اگر دو ماہ میں اس کی رقم پوری نہ ہوئی تو وہ تمہیں اٹھوالے گا۔ لیکن تم گھبراؤ نہیں، اس کی جرأت نہیں ہے۔ مجھے تو فکر اس بات کی ہے کہ دو ماہ میں ایک لاکھ سے زیادہ کی رقم ہم کس طرح دے سکیں گے؟“

”اُس کی کل رقم ستر ہزار ہیں ادا کرتی ہے۔ پھر یہ لاکھ سے زیادہ کا کیا مطلب؟“
”میں نے بھی یہی کہا تھا۔ مگر اُس نے مجھے رسیدیں دکھائیں تو اس میں بہت کم

ڈراپ کی سہولت نہیں دی تھی مگر شانزل خان نے آتے ہی ورکرز کے لئے پک ایڈ ڈراپ کی سہولت مہیا کی اور کینیٹنز میں کھانے کا اہلی و بہترین معیار مقرر کیا بلکہ اور قیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھانوں کی قیمتیں کم سے کم مقرر کیں۔ اب ہر ورکر اپنی پسند کا کھانا (جو شاید گھر میں مہینوں میں نصیب ہوتا ہو) بے ٹکری سے کھاتا تھا۔ چائے، آئس کریم، کولڈ ڈرنکس، سب کے ریٹ بالکل مناسب تھے۔

”آج اتنی جلدی آگئیں، خیریت تو ہے؟“ انا بی ٹکری مندی سے پوچھنے لگیں۔
 ”ہاں، آپ پریشان مت ہوں۔“ اُس نے بیک اور فائل ٹیبل پر رکھا، بیوروں سے سینڈل اُتار کر دھپ سے پلنگ پر لیٹ گئی۔ اُس کے اندر اضطراب ہی اضطراب پھیلا ہوا تھا۔

”اُس نے اپنا کھیل کھیلنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے بہت سمجھ کر چلنا ہو گا۔ اس کی ہر چال کو مات دینی ہو گی، اس سے کترانا، گھبرانا تو اس کے حوصلوں کو بڑھانا ہے۔ مجھے خود کو بہادر بنانا ہے، ہاں میں بہادر ہوں، میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔ شانزل خان نے میری طرف میلی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش بھی کی تو میں اس کی جان لے لوں گی۔“ وہ خود کو سمجھا رہی تھی، بہلا رہی تھی کہ جب سر پر پڑی تھی تو جھگٹتا تو تھا۔ ہمیشہ کی طرح اپنے دل کو سمجھا کر وہ جُرسکون ہو گئی۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر سوئی تھی اور شام کو مغرب کی نماز ادا کر کے تیار ہونے لگی۔ وقت مقررہ پر ڈرائیور آ گیا۔ وہ انا بی کو اللہ حافظ کہتی ہوئی کار میں آ بیٹھی۔

”غالب آپ بھول گئی ہیں کہ بزنس میٹنگ میں شرکت کرنے آئی ہیں۔“
 ”جی سر۔۔۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔ آپ کی تیاری تو ایسی ہے جیسے آپ میلاد شریف کی محفل میں شریک ہونے آئی ہوں۔“ اُس نے خاصے تنقیدی اور ناگوار لہجے میں اُس کے سادہ آسمانی ٹکڑے کے شلو اور سوٹ اور چادر نما دوپٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ لہجے بھر کو وہ بری طرح شینا کر رہی تھی۔
 ”میڈم! لباس ہمیشہ پارٹی کے معیار کے مطابق زیب تن کیا جاتا ہے۔ خصوصاً

بیٹھے بہت معمولی سے کام کرنے پڑتے تھے۔ چننیہ سے آتے جاتے پہلو ہائے ہوتی تھی۔ وہ معمولات کے کام نمٹا کر فارغ ہوئی تھی کہ پی اے شانزل کا پیغام لے کر آ گیا۔ وہ چادر نما دوپٹہ درست کرتی ہوئی اجازت لے کر اس کے آفس میں آ گئی۔

”آپ نے مجھے بلایا سر؟“

”ہی۔۔۔۔۔ سنگار پور سے جو ڈیلیکیشن آیا ہوا ہے، ان سے ہماری بزنس ڈیلنگ ہو گئی ہے۔ اس سے ہماری کمپنیز کو کرڈزوں کا پروڈنٹ ہو گا اور یقیناً ورکرز کو بھی۔ آج رات میں نے انہیں پارٹی دی ہے فائو اسٹار ہوٹل میں۔ آپ کو اینڈ کرنا ہے یہ پارٹی میرے ساتھ۔ گھر ابھی چلی جائیں، سات بجے ڈرائیور آپ کو آپ کے گھر سے پک کرے گا۔“
 ”سر، میں؟“ اُس کے اوسان خطا ہوئے، خطرے کی گھنٹیاں نزدیک بجنے لگیں۔
 ”ہوں۔۔۔۔۔ آپ۔“ دوسری طرف اطمینان دے بیٹھی تھی۔

”لیکن سر، میں۔۔۔۔۔ کس۔۔۔۔۔ طرح؟“ پریشانی اور خوف سے اُس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ سفید لٹھے کی مانند چہرہ ہو گیا تھا۔

”کیا آپ نے کبھی کوئی پارٹی اینڈ نہیں کی؟“ اُس نے استفسار کیا۔

”تو سر! اس طرح کی پارٹی تو ہرگز نہیں۔“

”پھر ضرور اینڈ کیجئے گا۔ انسان کو ہر قسم کے ماحول اور پارٹیز کا تجربہ ہونا چاہیے۔ اور اسٹیلی ورکنگ و منز کو۔ یہ فائل لے جائیں۔ یہ ضرور ساتھ لے کر آئیے گا۔ وہاں اس ایگریمنٹ پر سگنچر ہوں گے۔“

”لیکن سر۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“

”آئی ڈونٹ نو، لیکن آپ کو اپنے فرائض سے پہلو تہی کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جاییے اب آپ، نا تم پر تیار رہئے گا۔“ اُس نے نہایت زور کے اور سخت لہجے میں اسے حکم دیا تھا۔ وہ خاموشی سے فائل اٹھا کر آفس سے نکل آئی۔ نیچے ڈرائیور اُس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ غالباً اُسے پہلے ہی حکم مل گیا تھا۔ وہ خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور اُس سے راستہ معلوم کر کے کار ڈرائیو کرتا رہا۔ بڑے سر نے پک ایڈ

چاہئے۔ آخر صبر اور برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں اب قطعی صبر نہیں کر سکتا۔“
 رافع فیاض نے آتے ہی سخت غصے میں چیختے ہوئے کہا شروع کیا۔
 ”آہستہ بات کرو۔ یہاں مہذب لوگ رہتے ہیں۔ جب تمہیں کہہ دیا کہ رقم تمہیں مل جائے گی تو پھر کیوں بے صبر ہو رہے ہو؟“ خضریٰ اُس سے زیادہ دہنگ لہجے میں بولی۔

”کچھ تو اللہ کا خوف کرو رافع میاں! اوسے ہم نے تمہیں شریف آدمی جان کر رقم پر بھروسہ کیا اور رقم دیتے وقت کوئی رسید اپنے پاس نہیں رکھی اور تم نے بکے بے ایمان ہونے کا ثبوت دے کر ہمیں مزید ترسے کے بوجھ سے لا دیا۔ بہت افسوس کی بات ہے، موت کا تو خوف ہی نہیں ہے تمہیں۔ زندگی کا کیا بھروسہ نہ معلوم کب سانس بند ہو جائے تو سب مال و دولت یہیں پڑا رہ جائے گا۔ ساتھ میں صرف ایمان اور امثال جائیں گے۔“ انابی جو برتن دھو کر فارغ ہوئی تمہیں گیلے ہاتھ تولیے سے صاف کرتی ہوئی وہاں آ کر اس سے مخاطب ہوئیں۔

”میری موت کی نہیں، اپنی موت کی فکر کر بدھیا۔ مرنے کی عمر تیری ہے میری نہیں۔“

”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ورنہ تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔“ خضریٰ پر طیش انداز میں صحن میں رکھی سل کے بے کی طرف بڑھی تھی۔ اگر انابی اسے تیزی سے پکڑ نہ لیتیں تو وہ یقیناً یہ سب کر گزرتی۔ رافع فیاض کی بدتمیزی نے اسے از حد مشتعل کر ڈالا تھا۔

”کیوں اس بد ذات کے خون سے اپنے ہاتھ گندے کرنا چاہتی ہو بیٹی۔ اگر اس میں ذرا سی بھی غیرت وجہا ہوتی تو یہ تمہیں اٹھوانے کی بات ہی کیوں کرتا۔ اور نہ اس طرح ڈھٹائی سے آ کر اپنی بے ایمانی کا مظاہرہ کرتا۔“ انابی خضریٰ کے سر پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھیں۔

”میری رقم مجھے مقررہ وقت تک نہ ملی تو پھر دیکھنا میں کیسا بندہ ہوں۔“ وہ دھمکیاں دیتا ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا۔ انابی دروازہ بند کر کے آئیں تو وہ خاموش صوفے پر بیٹھی

جہاں ایسی پارٹیز ہوں وہاں تو بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر کیف آئے۔“ وہ گویا جبراً اُسے میننگ روم میں لے کر داخل ہوا تھا۔ میننگ کا دورانیہ پندرہ منٹ پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد بہت پر تکلف ڈنر تھا۔ ہال رنگین روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔
 ”سرا اب میں جاؤں گی۔“ اُس نے یہاں سے جانے میں عافیت سمجھی۔

”ہماری کمپنی کو اتنا وٹرنل آرڈر ملا ہے، جس میں ہمیں کروڑوں کی بچت ہے۔ کیا آپ اس خوشی کو تسلیم نہ نہیں کریں گی؟“ اُس نے حیرانی سے استفسار کیا تھا۔
 ”خوشیاں منانے اور شکر ادا کرنے کے سب کے اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ سر۔ میں ہمیشہ شکرانے کے نفل پڑھ کر اور خوشی کے آنسو بہا کر خوشیاں منانے کی عادی ہوں۔“

”اوکے، کھانا تو کھا لیجئے۔“ اُس کے لہجے میں پُر خلوص اصرار تھا۔

”نہیں سر۔ کھانا تو آج میں نے جلدی کھا لیا تھا، یہاں آنے کی وجہ سے۔ بارہ بج چکے ہیں، گھر پر انابی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ آپ مجھے گھر چھڑوا دیجئے۔“ نہ معلوم اُس کے دل میں کیا تھا کہ وہ چند ساتھیں از حد گہری نگاہوں سے اُس کے چہرے کی جانب دیکھتا رہا اور پھر گہرا سانس لے کر ڈرائیور کو بلا کر اُسے گھر چھوڑ آنے کا حکم دے دیا۔

”صاحب! سیٹلر ہٹ یا ڈیفنس؟“ ڈرائیور نے آہستگی سے مستی خیز لہجے میں پوچھا۔
 ”جہاں سے انہیں لے کر آئے ہو وہاں۔“ شانزل کے جواب پر ڈرائیور کے چہرے پر از حد حیرانی کے تاثرات پھیل گئے تھے۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ کوئی لڑکی گھر سے آ کر واپس گھر جا رہی تھی۔ ورنہ شانزل خان کے ساتھ آنے والی لڑکیوں کا ٹھکانہ شانزل خان کی مخصوص جگہوں پر ہوتا تھا۔ خضریٰ اُس کی سوچوں سے بے خبر خیریت سے گھر جانے پر اپنے رب کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اگر شانزل خان زبردستی پارٹی کے اختتام تک روک لیتا تو وہ مجبور ہو جاتی۔

”یہ میری آخری وارننگ ہے خضریٰ جی! مجھے دوناو کے اندر اندر اپنی بقایا رقم مل جانی

”ہم نے تو مثال قائم کر دی ہے، ہم نے ہمدردی واللہ کے خوف سے اس کی باتوں پر یقین کیا جو اب بے وقوفی و پاگل پن کہلائے گی۔ اب کیا کریں؟ کہاں ڈھونڈیں انہیں؟“

”انا بی! آپ گھر میں نہیں تھیں کیا؟ جب وہ سامان لے کر گئے ہوں گے تو آواز تو آئی ہوگی۔ اور محلے سے کسی نے بھی انہیں جاتے ہوئے نہیں دیکھا کیا؟“

”محلے والوں سے اتنے تعلقات کہاں ہیں۔ ٹھہرو میں سامنے والی سے معلوم کر کے آتی ہوں۔ اسے میں اکثر دروازے، کھڑکی سے جھانکتے دیکھتی ہوں۔ اس نے ضرور دیکھا ہوگا۔“

”پہلے منہ ہاتھ دھو لیں، پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“

”بھائو میں گئے منہ ہاتھ۔ میرے اندر آگ لگ رہی ہے۔ کس طرح لٹ گئے ہم لوگ۔ میں ہی بے وقوف تھی، کم عقل تھی۔ تم نے کتنا سبھایا بیٹی کہ نہ آؤں گے دار کی باتوں میں۔ ساری غلطی میری تھی۔ کیوں کرائے دار کی بیوی کی باتوں میں آئی۔ کیسے جھوٹے دلا سے دیتی تھی کجنت، مکار، آپا میری کمپنی چل رہی ہے پچاس ہزار کی۔ آپ کے کرائے کے روپے میں کمپنی میں بھر رہی ہوں۔ اگلے اپریل میں کمپنی مل جائے گی تو آپ کو کرائے کی بندھی رقم ایک دم مل جائے گی۔ اور باقی رقم میں لے لوں گی۔ میرے لئے یہ اچھی بات تھی کہ بڑی رقم یکمشت مجھے مل رہی تھی۔ میں نے تمہیں اس لئے نہیں بتایا کہ تم نہیں مانو گی۔ کاش میں تمہیں بتا ہی دیتی تو شاید ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے بھی سوچا کہ رافع فیاض کو اتنی بڑی رقم مل جائے گی تو وہ بار بار تنگ نہیں کرے گا۔ مگر ہائے ری قسمت، جب عقل پر چتر پڑے ہوں تو قسمت بھی سیاہ ہو جاتی ہے۔“

سامنے والی پڑوسن سے معلوم ہوا کہ وہ کرائے دار کو دروازہ تھوڑا تھوڑا سامان لے جاتے ہوئے ایک ہفتے سے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت جب وہ گھر میں نہیں ہوتی تھیں۔ دوپہر کے وقت گئی بھی سنسان رہتی تھی۔ کل دوپہر کو وہ سب ٹیکسی میں بیٹھ گئے، تب اس کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ دوسرے گھر میں شفٹ ہو رہے ہیں، یہ گھر خالی کر دیا ہے۔

تھی۔

”انا بی! کرائے دار سے کہہ کر کرائے کے روپے لیں، سال سے زیادہ ہونے والا ہے۔ اب میں اسے کوئی رعایت دینے پر تیار نہیں۔ چلیں میرے ساتھ اوپر۔“ وہ انہیں لے کر پچھلی گلی کے گیٹ سے باہر نکل آئی۔ کیونکہ اوپر کے پورشن کا گیٹ پچھلی گلی میں تھا اور نیچے کے جس حصے میں وہ اور انا بی رہائش پذیر تھیں، وہ فرنٹ سائیڈ پر تھا۔ اس طرح دونوں کا آسنا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی کام ہوتا، انا بی یا کرائے دار کے بیوی بچے ایک دوسرے کے پاس آ جایا کرتے تھے۔ یہ عکس عملی انا بی کی تھی۔ وہ دونوں کسی مرد کی موجودگی کے بغیر رہ رہی تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ کسی کو انکی اٹھانے کا موقع ملے۔

میزھیاں چڑھ کر اوپر آئیں تو گیٹ ہاتھ لگاتے ہی پورا کھل گیا۔ گھر سٹائے کی زد میں تھا۔ وہ حیران حیران ہی اندر چلی آئیں۔ گیلری، کمرے، کچن، ہاتھ روم سب خالی تھے۔ ہر طرف ویرانی اور سٹائے کا راج تھا۔ نہ وہاں کوئی سامان تھا اور نہ ہی کرائے دار۔ چند لمبے شک کثیفیت میں وہ کھڑکی کی کھڑی رو گئیں۔

”یہ لوگ کب گھر خالی کر گئے؟ اور بتا کر بھی نہیں گئے؟“

”ہائے اللہ! ایسا اندھیر، ایسا فریب اور دغا! آنکھوں میں ڈھول جھونک گئے۔“

حضرتی کو زمین آسمان گردش کرتے نظر آئے ہی تھے، انا بی کی آنکھوں میں بھی مارے پریشانی ورنج کے اندھیرا چھانے لگا۔ پندرہ مہینے کا کرایہ چڑھا ہوا تھا جس کی کل رقم میں ہزار روپے کے لگ بھگ بنتی تھی۔

”ارے لوٹ لے گئے ہمیں، ان کا بیڑہ فرق ہو، کیسے معصوم و شریف نظر آتے تھے میاں بیوی دونوں۔ اندر سے کس قدر خبیث لگے، کیسے خاموشی سے نکل گئے۔“ انا بی کے جھرجھر آنسو بہنے لگے۔

”دکھتی بار میں نے آپ سے کہا انا بی کہ ان لوگوں کی باتوں کا اعتبار نہ کریں۔ بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے کہ کسی کرائے دار سے پندرہ ماہ تک کرایہ وصول نہ کیا جائے؟“

”کرائے دار کا معاملہ میں نے رات ہی اللہ کے سپرد کر دیا تھا اور یقین جانتے ایسا کر کے میرے اندر کچھ ایسا روحانی سکون اور طمانیت اُترتی ہے کہ مجھے اب ملال بھی نہیں ہو رہا۔“

”بے شک..... جب ہم اپنے رب کو دل سے محسوس کرتے ہیں تو اس کی موجودگی کا احساس اس طرح روح اور جسم کو بے سکون و بے نیاز کر دیتا ہے۔“

”انا بی! کچھ ایسا ہے ضرور جو آپ مجھ سے چھپا رہی ہیں۔ پلیز..... آپ ابھی کچھ نہیں بولیں، پہلے میری بات سنیں۔“ اُس نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

”میرے افس جانے کے بعد آپ روزانہ کہاں جاتی ہیں؟ پھر میری واپسی سے قبل آ جاتی ہیں۔“

”میں..... میں کہاں جاؤں گی بیٹی۔ اور روز روز کہاں جا سکتی ہوں؟“

”میری طرف دیکھ کر کہیں انا بی۔ آپ کی نگاہیں آپ کی آواز کا ساتھ کیوں نہیں دے رہیں؟ اور کل رات سامنے والی پڑوسن نے بھی یہی کہا تھا کہ تم دونوں کے گھر سے جانے کے بعد کرائے دار سامان لے کر جاتا رہا ہے۔ اور ہوا بھی ایسا ہی ہے۔ میں نے آپ سے پوچھا کہ وہ اوپر سے سامان لے کر گئے ہوں گے تو آپ کو آوازیں نہیں آئیں؟ کیونکہ حجت ایک ہونے کے باعث بچے کے چھوٹے چھوٹے کھلونے گرنے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ آپ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔“

”اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو مجھ سے ابھی اس سوال کا جواب مت پوچھنا۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ ایک دن میں خود تم کو حقیقت بتا دوں گی۔“

ایک ماہ بعد شانزل خان کے تیر بد لائے گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ شرافت و بے نیازی کے ملبوس سے آزاد ہوتا جا رہا تھا۔ حضری کا ٹھوس اور بے چلک رویہ مضبوط کردار اُس کے لئے چیلنج بن چکا تھا۔ اس کی انہی پُر وقار خصوصیات نے پہلے دن ہی چوٹا دیا تھا

حقیقت جان کر انہیں بھی افسوس ہوا کہ انہیں معلوم ہوتا تو وہ انہیں قلعی جانے نہیں دیتیں۔

وہ ساری رات ان کی سوتے جاگتے پریشانی میں گزری۔ نئے کرائے دار کو گھر دینے سے وہ از حد خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ عورتیں اگر مرد کی سرپرستی میں نہ ہوں تو ہزار بھی ہوں تو تنہا کہلاتی ہیں پھر وہ تو صرف وہ تھیں۔ اس وقت وہ تنہی دامن، تنہی دست تھیں۔ چاروں طرف سے مصائب و پریشانیوں کے عفریت منہ پھاڑے ان کی سمت دوڑ رہے تھے جن میں سب سے قریب تر عفریت رافع فیاض تھا جو اپنی تمام تر خباثتوں اور کینکلیوں کے باوجود مضبوط حیثیت رکھتا تھا۔

انا بی عمر کے اس دور میں تھیں جہاں معمولی سی پریشانی و فکر اعصاب کو تہہ و بالا کر ڈالتی ہے اور ان کو گتے والا دھپکا تو ان کے اعصابی اعتبار سے بہت زیادہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بائی بلڈ پریش کے ساتھ انہیں بخار نے بھی جکڑ لیا تھا۔ حضری اگر فوراً ڈاکٹر کے پاس نہ لے جاتی تو یہ معلوم کیا ہوتا۔ صبح تک ان کے بخار اور بلڈ پریش میں خاصی کمی آئی تھی۔

”لوگ اپنی خود غرضی و مفاد پرستی کے آگے یہ نہیں سوچتے کہ ان کی کینیڑکتوں کے باعث کچھ لوگ جیتے ہی مر جاتے ہیں۔“ اُس نے زبردستی انا بی کو ناشتہ کراتے ہوئے سوچا۔

”تم بھی ناشتہ کرو۔ رات سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ شکر ہے آج چھٹی کا دن ہے۔ کس طرح افس جانتیں۔ میرے سامنے بیٹھ کر ناشتہ کرو تا کہ مجھے سکون ملے۔“

ان کے سامنے بیٹھ کر ایک سلاکس اُس نے چائے سے کھایا۔ دونوں کپ، کیتلی اور پلیٹیں دھو کر اُن کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟ میرا کرو، اب ہمارا فیصلہ اللہ کی عدالت میں ہو گا۔ وہ ہم سے چھپ گیا، لیکن اللہ سے کس طرح چھپے گا۔“ انہوں نے اس کا سر سینے سے لگاتے ہوئے گلو کیر لچے میں کہا۔

کہ اسے معلوم تھا ابتدا میں ایسا ہی ہوگا۔ وہ آہستہ آہستہ اصلیت پر آئے گی، پھر دوسرے دن اس نے چند سوٹ جو فیشن کے مطابق تھے، ڈرائیور کے ذریعے اُسے بھجوائے کہ وہ ایسے سوٹ پہن کر آفس آیا کرے جو اس نے ڈرائیور کو خوب سنا کر واپس کر دیئے تھے۔ لیکن وہ اس طرح کے سب ہتکنڈوں سے واقف تھا۔ بحال ہے جو ذرا بھی شرمندہ ہوا ہو بلکہ جلد ہی وہ اُسے ساتھ ڈنر اور پھر لُچ کی دعوت دے بیٹھا جو اُس نے سہولت سے مسترد کر دی تھی اور یہی نہیں بلکہ اس کا رویہ شانزل کے ساتھ شک واز حد سپاٹ اور زوکھا ہو گیا۔ اُس کی جھکی نگاہوں، کشادہ پیشانی و چہرے کے دلکش نقوش سے اس کے لئے نفرت و حقارت موملا دھار برسنے لگی تھی۔ بے تکلف تو وہ اس سے کبھی نہ تھی مگر اب اس کا حد درجہ گریز، احتیاط اور خاموشی چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ شانزل خان ایک بد قماش، آوارہ، بد کردار شخص ہے جس سے بچ کر چلنا ہر شریف زادی کا اولین فرض تھا۔ یہ سب کچھ اس کے وقار، عزت و مردانگی کے منافی تھا۔ وہ ایک لڑکی جو معمولی سی حیثیت کی حامل تھی، اُس کی ہٹ دھرمی اور رنگین مزاجی کے لئے ضد بن گئی تھی۔ اس نے بھی فیصلہ کر لیا تھا جب تک اس لڑکی کو اس کے اصل مقام پر لا کر نہیں چھوڑے گا جب تک باہر کی دنیا کا ہر عیش و آرام حرام تھا اس پر۔ بھلا اس لڑکی کی کیا حیثیت تھی؟

”خطرہ کی حیات! پلیز، میری ٹائی کی ٹاٹ تھوڑی لوڑ کریں۔“ اُس نے راکنگ چیئر سے سر ہٹا کر بالکل ایزی انداز میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اُس کے سامنے کبھی خطرہ کی کاغذی سے ڈانری پر چلتا قلم ٹھک کر ڈک گیا۔ اُس کے اس الٹے حکم پر اُس کی فراخ پیشانی پر ناگواری پھیل گئی تھی۔

”سوری سر! میں صرف یہاں آفس کے کام کے لئے اپائنٹ ہوں۔ اپنے پرستار سے مجھے دور ہی رکھیں تو بہتر ہوگا۔“ وہ کوشش کے باوجود لہجے کی سختی دہات پائی۔

”ہوں! میں اس وقت آفس میں ہی ہوں اور یہاں آپ سے جو کام لیا جائے گا وہ آفس کا کام ہی ہوگا اور آپ کو کرنا پڑے گا۔“

”میں ایسا کوئی کام نہیں کر سکتی جو میری عزت، وقار کے منافی ہو۔“

شانزل خان کو۔ اس خاموش اور اور گرد سے بیگانہ لڑکی میں کوئی تو خاص بات تھی جو اسے یہاں سب میں منفرد ظاہر کرتی تھی۔ وہ شخص جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے، اول درجے کا کائیاں اور ذہین تھا، جس کا وقت زیادہ تر حسین رنگین لڑکیوں کے سبک گزرتا تھا، جو جنس مخالف کو محض وقت گزاری کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ بہت سی حسین لڑکیاں اُس کی قربت کی خواہاں تھیں اور جنہیں وہ چند دنوں یا چند گھنٹوں سے زیادہ لٹ نہیں دیتا تھا، نہ چاہنے کے باوجود بلکہ بار بار جھٹلانے کے باوجود وہ اس لڑکی کے حلق سوچنے لگا تھا جس کی کوئی بھی اور اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اُسے یقین تھا، جس قدر وہ خود کو ٹیک پر وہیں ظاہر کرتی ہے، درحقیقت وہ ایسی ٹیک و پردے دار نہیں ہے۔ ایسے لوگ کھوکھلے و منافق ہوتے ہیں جو ظاہری طور پر مذہب پرستی کا پرچار کرتے ہیں لیکن ان کا باطن بالکل دین سے بے بہرہ و لاتعلقی ہوتا ہے۔ اسی ٹائپ کی کچھ لڑکیاں اُسے دوران تعلیم ملی تھیں جن میں خوبی سرمد کے رنگ و صفت بالکل خضری کی کا پی تھے اور پہلا بار وہ دل سے جس لڑکی کی عزت و توقیر کرتا تھا۔ لیکن سادگی، شرافت، مصونیت و پاکیزگی کے رنگ اتنے کچے اور پھیکے ثابت ہوئے کہ بادش کی یونوں سے بھیک کر اپنے بدنام و بد رنگ وجود کو ظاہر کر بیٹھے تھے۔ اُس کے دل سے پھر ہمیشہ کے لئے نسوانیت کا وقار و عزت زائل ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ آزاد، بے باک اور پردے کی قیود سے آزاد لڑکیوں کو ان لڑکیوں سے بہتر سمجھتا تھا جو جیسی جیسی ویسی ہی نظر آتی تھیں۔ کم از کم ان لڑکیوں کی طرح دوسروں کا اعتماد، خیر و اعتبار کا خون تو نہیں کرتی تھیں۔ خضری حیات، طوبی سرمد جیسی لڑکیوں کی نیچر سے وہ بخوبی واقف تھا۔ وہ پہل کبھی نہیں کرے گی بلکہ اس کی پیش قدمی کو بھی جبراً تائبند کرے گی جو محض ظاہری طور پر ہوگا اور پھر جب پردہ گرے گا تو بڑی بڑی بے باک اور ماڈرن لڑکیاں بھی تنہا ہی دانتوں میں انگلیاں دبا کر رو جائیں گی۔

اُس رات کو ہوٹل کے فنکشن پارٹی میں خضری کو بالکل سادہ سوٹ اور بڑی سی چادر میں سر سے پاؤں تک پیک دیکھ کر اُس کا فیصلہ سبک برآ حال ہوا تھا مگر وہ مصطفیٰ ضبط کر گیا تھا

”عزت، وقار کوڑیوں میں بکنا ہے میرے آگے۔“ اُس کا لہجہ حقارت آمیز تھا۔

”آپ کا ابھی ایسی لڑکیوں سے واسطہ ہی کہاں پڑا ہے۔ آپ گھٹیا اور تھوڑا ریٹ لڑکیوں سے شریف اور باعصمت لڑکیوں کو کسپیئر نہ کریں۔“ وہ اس کی کوئی بات برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔

”ریٹ تو ہر لڑکی کا ہوتا ہے، صرف ناز و ادا میں فرق ہوتا ہے۔ کوئی ڈائریکٹ یا نبھوں میں آجاتی ہے اور کوئی اپنی قیمت بڑھانے کے لئے نام نہاد شرافت و معصومیت کا پرچار کر کے مقابل کی آتش شوق کو بجھ کا کر منہ مانگی قیمت وصول کرتی ہے۔“

”ہر لڑکی ناٹ فار سیل ہوتی ہے سر۔ علاوہ آپ کی سوسائٹی میں سوو کرنے والی کچھ لڑکیوں کے۔“

”اچھا گویا آپ یہ بتانا چاہ رہی ہیں کہ آپ ناٹ فار سیل ہیں۔ لیکن.....“ وہ اٹھ کر اُس کے قریب چلا آیا جو غصے اور خنجر کے باعث پہلے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”ڈیئر سٹ! مجھے بھی ناٹ فار سیل چیزیں خریدنے کا زبردست ایکسپیرینس ہے۔ میں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ یہ بلیک بک ہے، یہاں جتنی چاہو رقم بھر سکتی ہو۔“ اُس نے کوٹ کی جیب سے چیک بک نکال کر ٹیبل پر رکھی۔ اُس نے جبکہ کر بیت بنی خضرئی کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشیاں لہجے میں کہا اور دوسرے لمحے آفس کی خاموش پُربیکون نقشا میں زوردار چھتر کی گونج اور تعاش پیدا کر گئی تھی۔ چند لمحے تک تو وہ ساکت سا رہ گیا۔ ایک معمولی سی بے اوقات لڑکی اور اس کی یہ جرات۔ وہ غضبناک سا آگے بڑھا۔

”خبردار، جو ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو۔“ اُس نے بھڑکی ہوئی شیرنی کی طرح چٹکھٹا کر کہا اور فروٹ ٹرے سے چمکدار نوک والا چاقو اٹھا کر لہرایا۔

وہ وہیں رک گیا۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس طرح اس پر ہاتھ چھوڑ دے گی۔ وہ اسے عام لڑکیوں کی طرح سمجھا تھا جو کہ اُس کی بے تحاشا دولت، ظاہری شخصیت و امارت سے مرعوب ہو کر اس کی ہوس کے جال میں پھنسے کو دل و جان سے

تیار رہتی تھیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی اُلٹا نکلا تھا۔ شاید یہ لڑکی زبردست ایکسپیرینس تھی۔ مگر وہ بھی کوئی عام معمولی شخص نہ تھا جو ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا۔

”تم سمجھتی کیا ہو خود کو۔ کیا ہے تمہارے پاس؟ سوائے شکل و صورت کے جو ہر جگہ بہت مل جاتی ہیں۔ ایک سے بڑا کر ایک حسین و خوبصورت، مجھ جیسوں کے لئے مختصر، راہوں میں آنکھیں پچھائے، اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے تیار ہیں۔ تم کیا چیز ہو؟“ وہ حقارت سے بولا تھا۔

”ہاں، ضرور ہوں گی۔ آپ جیسے جن کا نہ کوئی کردار ہوتا ہے نہ عزت و وقار۔ جو جانوروں کی طرح زندگی گزارنے پر غیرت سے مرنے کی بجائے فخر سے زندہ رہتے ہیں۔ جنہی اور بے فیئر لوگ۔“

”دیکھ لوں گا تمہیں نیک پروین۔“ وہ ڈھی ناگ کی طرح مل کھاتا ہوا پھنکارا۔

”مجھے کمزور مت سمجھئے۔ جب مجھے جیسی مجبور لڑکیاں گھروں سے قدم باہر نکالتی ہیں تو اپنی کمزوری و بے بسی پہلے ہی گھر کی دلہیز میں دفن کر دیتی ہیں۔“ وہ اس سے کسی طور متاثر نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ یعنی شانزل خان جس کی ایک نگاہ کے اشارے کی لڑکیاں ملنگھ رہتی تھیں آج ایک معمولی سی ورکر اُسے دھتکار رہی تھی۔ اُس کی حیثیت و انا پر کاری ضروریں لگا رہی تھی۔

”سوچ لو۔ اچھی آفر کو ٹھکرا کر برائٹ فیوچر کو بلیک کر رہی ہو۔“

”میرا فیصلہ اللہ کرے گا۔ آپ کو برائٹ اور بلیک ہونے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”بہت اونچا اڑ رہی ہو، اپنی پرواز سے زیادہ بلند۔ مگر..... ایک جھکے میں نیچے نہ لایا تو میرا نام بھی شانزل خان نہیں۔“ اپنے ہاتھ کی پشت پر دائیں ہاتھ سے ٹکا مار کر غرایا۔

”مجھے مظلوم تھا، بہت جلد آپ اپنی اوقات پر آجائیں گے۔ اور میں اسی وقت کا انتظار کر رہی تھی۔“ اُنکی انعام یوسٹر شانزل خان، میں ابھی اسی وقت آپ کی ملازمت پر

لیٹتا ہے۔ مگر جب رات کو تہائی میں سوچتا ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے، سراسر غلطی اسی کی ہے۔ اس کی چھپھوری حرکت پر نیک و معصوم لڑکی کا یہی رد عمل ہوتا چاہئے تھا۔ اور جناب! اس وقت ہیر و صاحب پر یہ معاملہ کھلتا ہے کہ وہ جس لڑکی سے بیزار و بے نیاز رہتے تھے، وہ تو نہ معلوم کب سے ان کے دل کے اندر قبضہ بنا کر بیٹھ گئی ہے۔ بیزار، بے نیازی اور خند دراصل ان کی محبتوں کا ہی انداز تھا۔ پھر تو بڑی مشکل سے ہیر و صاحب رات گزارتے ہیں اور فجر کے وقت مسجد کے بجائے ہیروئن کے گھر جاتے ہیں اور اُس کے اہباء امارا کی پرواہ کئے بغیر حال دل بنا ڈالتے ہیں۔ اور ہیروئن صاحبہ خود چپکے چپکے ان پر مرتی ہیں۔ وہ بھی شرمناک اعتراف کر لیتی ہے محبت کا۔ ہیروئن ہیر و کی شادی ہو جاتی ہے اور دونوں خوشی خوشی رہنے لگتے ہیں۔

”لیڈیز میگزین پڑھ کر تم ایسی ہی چپ استوریز پسند کر سکتے ہو۔“
 ”خواتین کو کچھنے کے لئے خواتین کے رسالے پڑھنا لازمی ہوتا ہے۔“
 ”فی الحال تم میرے رشتوں پر نمک مت چھڑکو۔ اگر میں تمہیں یہ بات بتا دیتا ہوں تو اس کا یہ مقصد نہیں کہ تم فضول میرا دل جلاؤ۔“ وہ ہنڈ پر بیٹھ کر جھجلا کر بولا۔
 ”میری بات مانو، رات بھر سوچو، ہو سکتا ہے مجھ تمہیں بھی احساس۔۔۔۔۔۔“
 ”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ گیٹ لاسٹ۔ چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“ اُس نے سخت اشتعال میں اُسے زبردستی کمرے سے نکال کر دروازہ اندر سے لاک کر لیا تھا۔

”ایڈیٹ، نان سنس ہر بات مذاق سمجھتا ہے۔“ اُس نے غصے سے کہا اور ایک بار پھر شہلا شروع کر دیا۔ یہ عمل اُس کا رات سے جاری تھا۔ خطرہ حیات نے گویا اُسے عرش کی رفعتوں سے پاتال کی ذلت آمیز گہرائیوں میں لا پٹا تھا۔ وہ بے جان ڈیکوریشن تیس سے چاند ارجم تک خریدنے کا عادی تھا۔ بچپن سے اب تک ہر قسمی سے قیمتی شے اُس کے ایک اشارے پر حاضر کر دی جاتی تھی۔ پھر خطرہ حیات جیسی بے حد معمولی لڑکی کی یہ جرأت کہ نہ صرف اُس کی پیشکش کو ٹھکرائے بلکہ اس کے چہرے پر نفرت و

تھوک کر جا رہی ہوں۔ اور اگر آپ نے اب کوئی فضول دھمکی یا اصول بتانے کی کوشش کی تو میں مجبوراً پولیس میں رپورٹ کر دوں گی اور لوگوں کو بتا دوں گی کہ آپ کس طرح سے اپنی ورکرز کی عزتوں کا سودا کرتے ہیں۔“ اُس نے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا اور محفل سے اپنا بیک اٹھا کر ہمیشہ کے لئے شانزل گروپ آف انڈسٹریز کو خیر باد کہہ آئی۔ لیکن اپنے پیچھے کھڑے شانزل خان کی زہر خند مسکراہٹ نہ دیکھ پائی تھی!

”کھوئے ہوئے سے رہنا دن کو، روتے پھرتا راتوں کو جو ہیں عاقل وہ کیا سمجھیں عشق و جنوں کی باتوں کو۔ وہ جو نہ آئے بادل چھائے، گرجے برسے، کھل بھی گئے اس کے سوا ہم بھر کے مارے کیا جائیں برساتوں کو۔“

”اوہ شٹ۔ فضول بکواس کرنے سے بہتر ہے خاموش رہو۔“ اُس نے گھور کر شہر یاں کو دیکھا جو گھنٹوں سے اُسے ادھر ادھر مارٹ پاسٹ کرتے ہوئے دیکھ کر شہر ستا رہا تھا۔
 ”غصہ تھوک دوا اب۔ کب تک اپنی ٹانگوں پر ظلم کرتے رہو گے؟“

”غصہ؟ میرا دل خود کو شوٹ کرنے کو چاہ رہا ہے۔ نہ معلوم میں کس طرح اور کیوں اس احمق سی لڑکی سے تھپڑ کھا گیا اور اُس کی فضول بکواس سن کر بھی اُسے جانے دیا۔“

”جب کوئی چپ کر دل میں بیٹھ جاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ محبت کی ابتدا ایسے ہی ہوتی ہے میری جان۔ کل ہی تو میں نے ایک استوری اس طرح کی پڑھی تھی۔ ہیر و بالکل تمہاری طرح ہوتا ہے پینڈم، خوبرو اور دولت مند ماں باپ کی اکلوتی اولاد اور اس کا کرئیر بھی بالکل تمہاری طرح ہوتا ہے۔ پلیز۔۔۔۔۔۔ پلیز مائنڈ مت کرو۔ تو وہ لڑکا اپنی رتیلین دنیا میں مست زندگی گزار رہا ہوتا ہے کہ اچانک اُس کی ملاقات تمہاری سیکرٹری جیسی لڑکی سے ہوتی ہے۔ ہیر و صاحب اسے بھی عام لڑکیوں کی طرح سمجھ کر غلط کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ لڑکی شریف و باجیا ہوتی ہے۔ ایک دن ہیر و صاحب کی بڑھتی گستاخی اُسے یعنی ہیروئن صاحبہ کو مشتعل کر دیتی ہے اور وہ ہیر و کے منہ پر تھپڑ دے مارتی ہے۔ اس وقت ہیر و صاحب کو از حد غصہ آتا ہے لیکن وہ تمہاری طرح ضبط و برداشت سے کام

اور تیزی سے زپ کھول کر بیک چنگ پر بھی دھانٹ چادر۔ پر الٹ دیا۔ اور دوسرے لمحے اس کے منہ سے حیرت و خوف کی ٹی ٹلی جھج نکلی تھی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی نگاہوں سے چادر پر پڑی ٹائی پن اور رست وایج کو دیکھ رہی تھی جن میں جگمگاتے ڈائمنڈز کی قیمت کا اندازہ وہ لگا بھی نہیں سکتی تھی۔ بلاشبہ وہ گھڑی اور ٹائی پن شانزل خان کی ملکیت تھیں مگر اس کے بیک میں کس طرح آئیں؟ اس نے خود یہ چیزیں رکھی نہیں تھیں، خود سے وہ چیزیں بیک میں آئیں سکتی تھیں تو پھر..... شانزل خان خود..... اور اگر اس کی یہ چال ہے تو بڑی خوفناک ہے۔

گھبراہٹ و پریشانی کے باعث اس کے ہاتھ جھڑپے جان سے ہو گئے تھے۔ ابھی وہ ڈھنگ سے سوچ بھی نہ پائی تھی کہ دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا تھا۔ اس نے گھڑی اور پن اٹھا کر بیک میں ہی ڈالے اور اسے محفوظ جگہ پر رکھ کر باہر مچن میں آگئی جہاں دروازہ تھا۔

”کون ہے؟“ اس نے حسب عادت دروازہ کھولنے سے پیشتر معلوم کیا۔
 ”میں ہوں ثانیہ۔“ دروازہ اس نے کھولا تو وہ بہت مگر بھوشی سے اس سے پٹ گئی۔
 ”کہاں گئی تھیں تم؟ چہرہ دن سے چھٹی پر ہو۔“ خضرتی نے اس کے برابر صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”تم ان دنوں بہت بڑی تھیں اس لئے بتانے کا موقع ہی نہ ملا۔ دراصل لاہور سے خالہ اور خالو آئے تھے، ساتھ خالو کے کچھ رشتے دار بھی تھے۔ ان کی مہمانداری کی خاطر چشیاں لیٹا پڑیں۔“

”مہما بھی مگر پر نہیں تھیں؟ کوئی اجنبی مہمانداری تھی کیا؟“ آخری بات اس نے کچھ شوشی سے کہی تھی۔ دل کے اندر تو اس کے پریشانی کا طوقان تباہی مچا رہا تھا مگر اپنی پریشانی وہ کسی باہر کے بندے سے شہر کرنے کی عادی نہ تھی۔ جبر اسوہ چنچ کیا تھا۔

”میں نے تو یہ غلوں میزبانی کی تھی۔ لیکن کہتے ہیں جو کام بے غرضی و غلوں سے کیا جائے، اس کا صلہ اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ میری مہماندان انہیں اس قدر بھائی کہ وہ فوراً

حقارت کا نشان بھی ثبت کر دے۔“
 ”نوٹ ایسا بیل خضرتی حیات اس تھپڑ کی قیمت تمہیں اتنی مہنگی پڑے گی کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ اس نے وحشت جنوں میں نچل پر رکھی ہوس منہ سے لگاتے ہوئے خوفناک انداز میں سوچا۔

”بیٹی! دروازہ بند کر لو۔ اور سنو، مجھے دیر ہو جائے گی مارکیٹ سے واپسی میں۔ پریشان مت ہونا۔ کبھی دروازے تک خوب چکر لگا کر ناگئیں دکھاؤ۔ طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔“ انابی نے دروازے سے باہر جاتے جاتے بھی کوئی تیسری بار تاکید کی تو وہ اثبات میں سر ہلاتی دروازے کی اندر سے کھڑی لگا کر کمرے میں آ کر چنگ پر دروازہ ہو گئی۔ انابی کو اس نے کل کا واقعہ بالکل بھی نہیں بتایا تھا۔ آج طبیعت کا خرابی کا بہانہ کر کے گھر میں تھی اور جب تک دوسری ملازمت کا بندوبست نہیں ہوتا، تب تک کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اسے گھر رہنا تھا۔ شانزل خان جیسے لوگ اپنی بد فطرتی، بد کرداری و عیاش طبع کو تسکین پہنچانے کے لئے حد سے گزر جاتے ہیں۔ اس قدر بچ اور اسنے کھٹیا کر کسی شریف کی چادر تار تار کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ سب کچھ بن مانگے مل جانے پر بچہ ہر شکر ادا کرنے کی بجائے خود کو خدا سمجھتے لگتے ہیں۔ زندگی گزارنے کے لئے ان جیسے بے ضمیروں کے پاس کچھ اصول، کچھ ضابطے ہوتے بھی ہیں یا نہیں، ریا و غرض سے بڑ باتیں، کھوکھلے قہقہے، ہوس زدہ محبتیں جنہیں رب نے ہر طرح سے مالا مال کیا، خوب نوازا مگر جن کی خیریت سیر نہیں ہوتی، خواہشوں کے بے لگام گھوڑے پر سوار جو آگے اور آگے کی سمت دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ جن کے لئے شرافت اور خیانت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ابھی نہ معلوم سوچوں کے جنگل میں کب تک بھٹکتی کہ معاً دروازے پر کسی سائل نے صدارت کی تھی۔ اس نے بیک سے پانچ کا نوٹ نکالا تو کوئی بڑ اس کے ہاتھ سے مگرانی تھی۔ اسے عجیب سی چھین کا احساس ہوا تھا۔ وہ تیزی سے فقیر کو پانچ روپے دے کر آئی

”شٹ اپ۔ آپ کو یہ انتہائی گھٹیا حرکت بہت بھاری پڑے گی مسٹر شانزل خان۔“

”آہا..... آج محسوس ہوا میرا نام کتنا خوبصورت ہے اور کسی کے حسین ہونٹوں سے نکلنے کے بعد تو حریف حسین لگ رہا ہے۔“ دوسری طرف سے قہقہہ گونجا۔

”یعنی ایسے کوئی اصول نہیں ہیں کہ ریز انڈن دینے سے تین ماہ قبل فرم کو انعام کرنا ضروری ہے، اگر فوراً ریز انڈن دینا ہو تو جرمانے کے طور پر ایسی رقم فرم کو دیں تو ریز انڈن منظور ہوتا ہے، ورنہ نہیں۔“

”یہ جیلے آپ اگر اپنی جیسی کسی تھرڈ کلاس گرل فرینڈ سے کہیں تو بہتر ہے۔ میرے بیک میں خاموشی سے گھڑی اور پن رکھ کر آپ کیا سمجھتے ہیں مجھے شکست دے دیں گے؟“

”شکست تو تمہیں ہو چکی ہے ڈیز! مگر انا پسند اور ہٹ دھرم ہوں مانو گی نہیں۔ میں چاہتا ہوں۔“

”وہ دونوں چیزیں ڈرائیور کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ مہربانی فرما کر آئندہ مجھے کال کرنے کی زحمت مت کیجئے گا۔“

”نو۔۔۔۔۔ نو۔۔۔۔۔ لوائیسی لٹلٹی مت کرنا۔ اگر ڈرائیور کے ہاتھ دست وایج اور عائی پن بھیجا تو انجام کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔“ دعوت بھرے لہجے میں دھمکی دی گئی۔

”واٹ پو مین؟“ وہ فیسے سے چٹکی تھی۔

”آئی مین، دست وایج اور پن آپ خود لے کر آؤ۔ اور۔۔۔۔۔“

”میں قسم کھا چکی ہوں کہ اب کبھی آپ کی فرم میں قدم نہیں رکھوں گی۔ قسم ٹوٹنے سے

بہتر میں جان دینا پسند کروں گی۔“ اس نے اس کی بات قطع کر کے سخت لہجے میں کہا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، تم فرم مت آؤ۔ میری بھی یہی خواہش ہے کہ تم سے

اب ملاقات آفس سے باہر ہو۔ چلی آؤ، ڈرائیور تمہیں میرے پاس لے آئے گا۔ میں

تمہیں خوش کر دوں گا۔ اتنی دولت دوں گا کہ۔۔۔۔۔“

”میں تمہیں ہوں تمہاری دولت پر کروڑ بار۔ سمجھے؟“

”ہم تو اس مقام پر آ گئے ہیں جہاں سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی

ہیں۔ اب سوچنے اور سمجھنے کی باری تمہاری ہے۔ اگر کل تک تم میرے پاس وہ سامان

لے کر نہیں آئیں تو کل شام تک میں تمہارے دروازے پر پولیس کے ہمراہ موجود ہوں گا

اور فقط تم پر دست وایج اور عائی پن کی چوری کا الزام نہ ہوگا بلکہ سوچ لو، آفس کے سیف

سے لمبی چوڑی رقم کی چوری بھی تمہارے نام لگ سکتی ہے اور تمہارے گھر سے برآمد بھی

ہو سکتی ہے۔ میں کس خفیہ انداز میں کام کرتا ہوں یہ تو تم سمجھ ہی گئی ہوگی۔ سوچ لو، خوب

اچھی طرح سوچ لو۔ ساری رات تمہارے پاس ہے۔ کل شام ڈرائیور آئے گا۔ اگر عزت چاہتی ہو تو خاموشی سے چلی آنا ورنہ۔۔۔۔۔“ دوسری طرف سے دھمکی دے کر لائن آف کر دی گئی تھی۔

دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ آخر کار وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ڈرائیور باہر نہیں تھا، وہ اُسے سو بائیں دے کر جا چکا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر الجھ چکی تھی کہ ٹانگیں سے اتنی دیر سے آنے کا سبب بھی نہ پوچھ سکی۔ وہ بھی آتے ہی وضو کر کے مغرب کی نماز پڑھنے لگی تھیں۔

ساری رات کی سوچ بچار کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ کل ڈرائیور کے ساتھ وہ دونوں چیزیں دینے جائے گی۔ آگے کنواں، پیچھے کھائی والا حساب اس کے ساتھ تھا۔ اگر ڈرائیور کے ساتھ نہیں جاتی تو اس کا مضبوط لہجہ گواہی دے چکا تھا کہ جو اس نے کہا ہے وہ کر دکھائے گا۔ اور وہ یہ کب برداشت کرتی کہ گھر پر پولیس آ کر اسے چوری کے الزام میں گرفتار کر کے لے جائے اور اس کے ساتھ خاندانی عزت و وقار کا بھی جتنا زہ نگل جائے۔ جو اسے کسی طور بھی منظور نہیں تھا۔ بھلا اس کا کون یقین کرتا کہ وہ بے گناہ ہے۔

”انانی! چل رہی ہیں تانائے کے مایوں میں؟“

”بھئی! تم چلی جاؤ۔ میری طرف سے معذرت کر لیتم۔ میں شادی والے روز آ

جاؤں گی۔“

”آپ کو چھوڑ کر جانے کو دل نہیں مان رہا۔“ وہ ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر لاڈ

بھرے لہجے میں بولی۔

”مجھے معلوم ہے بھئی۔ لیکن ثواب حاصل کرنا بھی سعادت ہے۔ تم میری طرف سے

بے فکر رہو اور خوشیوں میں دل سے خوش ہونا۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں مسکراتے دیکھے

ہوئے۔“ وہ اُس کی پیشانی چومتی ہوئی شفقت سے گویا ہو گئی۔ پڑوس میں رہنے والی

فاخرہ باجی کے آج کل میں پہلی ڈیلیوری ہونے والی تھی۔ دو سال قبل وہ بچہ دیش سے

اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔ یہاں ان دونوں میاں بیوی کا کوئی عزیز رشتے دار

رہا۔ کسی روز اتانی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اتانی جیسی شخصیت پر خلوص حراج رکھنے والی سے جو ایک بار مل جائے وہ تاحیات ان کے خلوص اور سروت کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ پھر تو اتانی کو وہ میاں بیوی از حد چاہنے لگے ماں کی طرح۔ کل قاخرہ بانگی کے میاں کام کی وجہ سے پنجاب گئے تھے ایک ہفتے کے لئے اور اتانی کو خیال رکھنے کا کہہ گئے تھے۔ جانیہ کی شادی کا کارڈ دیکھ کر انہوں نے کہا کہ وہ چلی جائے، وہ قاخرہ کے پاس رہیں گی کہ انہیں کسی بزرگ کی اشد ضرورت تھی۔

کشادہ شفاف سرخوں پر کار بے آواز دوڑ رہی تھی۔ وہ بچھلی سیٹ پر کسی محنت کی طرح جی ہوئی تھی۔ تمام ہلچل، بے چینی، پریشانی و اضطراب سمندر کی ریت کی طرح تہہ در تہہ پیٹھ گئی تھی۔ ذہن اس وقت بالکل کسی سیپ کی مانند خالی تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اس نے اس قدر سوچا تھا کہ اب کوئی سوچ باقی نہیں بچی تھی یا ذہن ہی مطلوب ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے پورچ میں کار روکی تو اس نے سر اٹھا کر سبزے کے درمیان بنے عالیشان جنگل کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ ڈرائیور کے ہمراہ چلتی کئی کوریڈورز، کمرے عبور کر کے وہ ایک بے حد ڈیکور شدہ کمرے میں آئی تھی۔

”یہاں بیٹھیں میڈم آپ۔“ مہرا بھی آتے ہیں۔“ ڈرائیور نے ویلٹ کے بیرون ٹکر صوفے کی طرف اشارہ کر کے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ ڈرائیور چلا گیا تھا۔

قیمتی فرنیچر، بیش قیمت اور خوبصورت پینٹنگز سے مزین دبیز قالین اور خوبصورت قیمتی ویلٹ کے پردوں سے محو کن خوشبوئیں بھوٹ رہی تھیں۔ ماحول خامسا خوابناک تھا۔ حالانکہ ابھی شام کے سائے ہر سو پھیلے ہوئے تھے مگر یہاں نصف رات گزر جانے کا گمان ہو رہا تھا۔ یکدم ہی اُس پر وحشت سی سوار ہونے لگی تھی۔ ہر طرف اتنی خاموشی تھی کہ اُسے اپنا دم گھٹنا ہوا محسوس ہونے لگا۔ گھبرا کر وہ کھڑکی کی سمت آئی۔ دھیرے سے تھوڑا سا پردہ ہٹایا تو کسی شخص کی پشت نظر آئی تھی۔ وہ کان سے موبائل لگائے کسی سے محو گفتگو تھا۔ اس نے غور سے دیکھا تو ہاتھ گاؤں میں لمبوں وہ کوئی اور نہیں شانزل خان ہی

تھا جس کی مسکراتی فریش آواز اتنی بلند تھی کہ اس کی سماعتوں میں یا آسانی پہنچ رہی تھی۔ ”شٹ یا! ہم ڈال ڈال بیٹھنے والے تنہا ہیں۔ جہاں مطلب کا دانہ پانی ملا۔ طبیعت سیر کی اور دوسری جانب پرواز کی۔ یہ شادی تم جیسے اسٹوڈنٹ لوگ کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد کس طرح ایک ہی چہرے کے ساتھ ساری زندگی گزار لیتے ہیں۔ میری زندگی میں لڑکیاں بیوز پیچہ کی طرح آتی ہیں۔ جس طرح چند گھنٹے اسٹوڈی کے بعد ٹیچر پیچہ بور اور ردی ہو جاتا ہے اسی طرح.....“ دوسری طرف سے نہ معلوم کیا کہا گیا تھا کہ وہ بیٹھنے لگا تھا۔

”بھئی یہ عشق و محبت کی باتیں ہم جیسے لوگ نہیں جانتے۔ ہم صرف خریدنا جانتے ہیں یا توڑنا، جو پسند آجائے اسے منہ مانگی قیمت دے کر خرید لیتے ہیں اور جو ٹاٹ فارسل ہوتی ہے اسے ریزہ ریزہ کر ڈالتے ہیں۔“ اُس کے لہجے میں ایسی حکارت و تحقیر تھی کہ خضریٰ کے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ اگر اس کے پاس ریوالور ہوتا تو ساری گولیاں اس کی پشت میں اتار دیتی۔ عورتوں کو کمتر اور بکاؤ مال سمجھنے کا حق اسے کس نے دیا تھا۔

”دیری دیری تھینکس، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ عورتیں کتنی نیک، پارسا، باوقار اور ساتھ نبھانے والی ہوتی ہیں یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ بہر حال جب بھی پاکستان آؤ، میرے پاس ہی ٹھہرنا۔ میری آخر ہے۔ اوکے..... مجھے اجازت دو، میری انٹرنل میٹ میرا لیونگ روم میں انتظار کر رہی ہے..... ہا..... ہا..... جب سب کچھ آسانی سے مل رہا ہو تو پھر مجھے تمہاری طرح اسٹوڈنٹ بننے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔“ اُس نے بے ہاک تہقیر لگاتے ہوئے موبائل آف کیا تھا اور اسے نیمل پر رکھ دیا تھا۔

خضریٰ نے جلدی سے پردہ چھوڑ دیا۔

”یا اللہ..... یا اللہ! آخر ہم جیسے لوگوں کو کیوں پیدا کرتا ہے جب ہمارے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہوتی تو۔“ شانزل خان کا ارادہ ایک دم ہی اس پر ظاہر ہوا تو وہ وحشت زدہ سی گیت کی سمت بھاگی تھی اور دوسرے لہجے زمین اُسے پیروں کے نیچے سے نکلتی

وہ بہکا بہکا لڑکھڑاتا ہوا اس سے کچھ قدم کے فاصلے پر بڑک گیا تھا۔
 خطرئی حیات اضطرابی طور پر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے اعصاب یکدم ہی تناؤ کا شکار ہو
 گئے تھے۔ ایک تو اُس کا آؤٹ آف کنٹرول اندازہ متضاد بیہودہ لہجہ، اس کا سارا خون
 چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

”مسٹر شانزل خان! میں آپ کی ان اوجھی اور شرمناک حرکتوں کے پھندے میں
 نہیں چھپنے والی۔ وہ آپ کی گھنیا چیزیں پڑی ہیں، انہیں سینے سے لگائیے۔ میں جاری
 ہوں۔“

”ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ابھی تو آپ آئی ہیں۔ کچھ ہمیں خاطر مدارات کا موقع تو
 دیں۔ کچھ اپنی کہیں، کچھ ہماری سنیں، کیا جلدی ہے؟“ وہ صوفے کی طرف اشارہ کرتا
 ہوا بولا۔

”تو جھٹکس۔ میں جانا چاہتی ہوں۔“ وہ بدستور کھڑی تھی۔

”خطرئی حیات! کیوں وقت برباد کر رہی ہیں؟ میری آخر زڈ مل بھی ہو سکتی ہیں۔
 میں آپ کو وہ سب کچھ دے سکتا ہوں جس کی چاہ ہر لڑکی کے دل میں ہوتی ہے۔ بلکہ
 آپ چاہیں تو میں فارن کنٹری میں سیشن کروا سکتا ہوں۔ آپ وہاں اپنی فیملی کے ساتھ
 پُرچیش زندگی گزار سکتی ہیں۔ میری بات مان لیں، میں کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں آپ
 کے ساتھ۔“

”میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا شانزل صاحب! کہ میں تھرڈ ریٹ لڑکی نہیں
 ہوں اور میں اب بھی کہہ رہی ہوں، دنیا کی تمام دولت بھی مجھے نہیں خرید سکتی۔“ اُس کا

ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ خبیث ڈرائیور دروازہ باہر سے لاک کر گیا تھا۔

”جان سن!

جان تمنا!

جان بہاراں!

جان شانزل!

وٹکم مائی ہاؤس، وٹکم مائی ہارٹ، وٹکم مائی سویت ہارٹ!“

وہ غبار آلود لہجے میں بہکا بہکا اندر آ کر گنگنایا.....!

لجے بے خوف تھا۔

وہ چند لمبے اُس کی جانب شمار آلود نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر بے اختیار ہنستا چلا گیا۔

”جانتا ہوں..... خوب جانتا ہوں تم جیسی لڑکیوں کو۔“

”دروازہ کھولے، میں جانا چاہتی ہوں۔“

”ہاں چلی جانا۔ میں نے کب منع کیا ہے۔ لیکن پہلے حق میزبانی تو ادا کرنے دیں۔“

فیز بیٹھیں تو کسی آپ۔ وہ صوفے پر گر گرنے کے انداز میں بیٹھتا ہوا بولا۔

”مجھے یہاں نہیں بیٹھنا۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔“

”کیوں؟ مجھ سے خوفزدہ ہیں؟“ اُس نے بے تحاشا سرخ نگاہیں اس کے چہرے پر

زال کر تھمرا نہ انداز میں پوچھا۔ شانزل کے ہر انداز سے اطمینان و برتری جھلک رہی

تھی۔ جوایا اُس نے کچھ نہیں کہا لیکن چہرے سے سخت کبیرگی اور جھجھکاہٹ کا اظہار ہو

رہا تھا۔ شانزل خان کی سرخ ہانکی نگاہیں اُس کے رُف بدلتے چہرے پر اس طرح مرکوز

تھیں جس طرح لوہا متناطیس سے چپک جاتا ہے۔

”کم ان یار! اشارت ات۔ بہت ہو گیا یہ پارسائی اور شرافت کا ڈرامہ۔ کیوں چم

ضائع کر رہی ہو۔ آجاؤ۔ تمہارے تمام اخراجات میرے ذمے۔ پھر تو تم میرا ہو، کس

بات کا خوف ہے تمہیں؟ شاید اپنے مسیبت کا؟ اُسے کیا معلوم ہو گا۔ مرد تو ویسے ہی

عورت کے آگے عقل و ہوش گنوا دیتے ہیں اور خصوصاً حسین ترین عورت کے مسیبت تو

بالکل ہی کانٹے کے آلو ثابت ہوتے ہیں۔ بیویاں کسی کے ساتھ بھی وقت گزاریں، وہ

اس خوش فہمی میں گمن رہتے ہیں کہ بیگم صاحبہ کسی دوست یا ریلو کے ساتھ تھیں۔“ اُس

نے زہرے لے تھمے لگاتے ہوئے خامیہ خیر مہذبہ باند لہجے میں کہا۔

”مجھے آپ کی اس بیہودہ اور پست گفتگو پر کوئی افسوس و حیرانگی نہیں ہو رہی۔ رنج و

لال مجھے اپنے سیاہ نصیب پر ہے جو بد نصیبی مجھے آپ جیسے گرے ہوئے بے حیثیت

انسان کے در پر لے آئی ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو اُس کے رخساروں پر بہہ

نکلے تھے۔

”چہ..... چہ..... ڈونٹ ویپ۔ ہم بہت زیادہ گرے ہوئے اور بے حیثیت کسی گھر

اب اتنے بھی گرے ہوئے نہیں کہ آپ کی حسین آنکھوں میں آنسو دیکھ سکیں۔“

”مگر آپ میں معمولی سی بھی حیثیت ہے تو مجھے جانے دیں۔“

”آپ کو جانے سے کس نے روکا ہے؟ آپ جائیں گی۔ بلکہ ہم خود آپ کو عزت

کے ساتھ چھوڑ کر آئیں گے۔ لیکن..... پہلے یہاں جو آتش بھڑک رہی ہے اس کو ٹھنڈا کر

لیں۔“ اُس نے باتیں جانب سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی طرف اشارہ کیا۔ پھر کہنے لگا۔

”معلوم ہے مرد کو بد نظرت اور بے حیثیت کرنے والی کون ہوتی ہے؟ وہ عورت ہوتی

ہے جو کبھی تمہاری طرح پردے و پاک دامنی کا ڈھونگ رچا کر ہم جیسے مردوں کو راہ سے

بھٹکاتی ہے تو کبھی نام نہاد پردے کی قید سے بھی آزاد ہوتی ہے۔“ یکدم ہی وہ پھر کر اٹھ

کھڑا ہوا تھا۔ اُس کے لہجے اور آنکھوں سے آگ برسنے لگی تھی۔ ایک عجیب رنگ اس

کے چہرے پر چھا گیا تھا جس میں تکلیف و درد کی کیفیت نمایاں تھی۔

”میں یہاں آپ سے بحث کرنے نہیں آئی۔“

”میری خواہش پوری کر دو۔ پھر خود چھوڑ آؤں گا۔“ وہ اس کی بات قطع کر کے بولا۔

”ہرگز نہیں۔ میں موت کو گلے لگا لوں گی مگر آپ کو ناپاک ارادوں میں کبھی

کا مایاب نہیں ہونے دوں گی۔“ خضریٰ اُس پر وحشی پن سوار ہوتے دیکھ کر مضبوط لہجے

میں کہہ اٹھی۔

”اپنی خواہش کی تکمیل سے قبل تو میں تمہیں مرنے بھی نہ دوں گا سویت ہارٹ۔“

اُس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا ہی تھا کہ فضا یکھٹ بے پناہ

فائرنگ سے گونج اٹھی۔ بے اختیار شانزل نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اسی دم زوردار

دھماکے کے ساتھ ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔ فائرنگ کی آواز شدید ترین ہو گئی تھی۔ شاید

اندروں سے بھی جوانی فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ اس دوہری افتاد پر وہ بالکل ہی حواس باختہ

ہو گئی۔ لائٹ آف ہوتے ہی کمرہ تاریک قبر جیسا ہو گیا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ بھانکی دے

”سوچوں کے جنگوں میں زیادہ دیر نہیں بھٹکتا چاہئے۔ اس طرح منزل بس کم ہو جاتی ہیں اور راستے کھو جاتے ہیں۔ بھوک لگ رہی ہوگی آپ کو؟ کچھ دیر رک جائیں۔“ اسے خوفزدہ و متوحش اور کم مہم دیکھ کر اس نے مہربان لہجے میں تسلی دی۔ گویا اس کے لئے یہ کوئی پریشان کن بات نہیں تھی۔

”آخر یہ سب کیا ہے؟ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟ وہ بھی میری اجازت کے بغیر۔“

”آپ کے سوال کا جواب دے چکا ہوں۔ اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں آپ کی مرضی کے بغیر آپ کو لے آیا ہوں تو واقعی میں اس جسارت پر معذرت خواہ ہوں۔ دراصل میں بقول آپ کے بہت گرا ہوا شخص ہوں، مگر اتنا گھٹیا اور بے حیثیت نہیں کہ اپنے دشمنوں کے درمیان آپ کو چھوڑ آتا۔ آپ جلد ہوش میں نہ آنے کی قسم کھا کر شاید بے ہوش ہوئی تھیں کہ کوششوں کے باوجود جب ہوش میں نہیں آئیں تو مجھے مجبوراً اپنے ساتھ لانا پڑا۔ اللہ گواہ ہے، یہاں میری نیت میں کھوٹ نہیں تھا۔“ وہ اسی طرح اس کے طرف رخ کئے ہوئے گھٹکھٹکا تھا۔

”جھوٹ بول رہے ہیں۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”نہیں۔ ہم تو بہت گناہ گار بندے ہیں۔ غنائی مسلمان۔ لیکن آپ تو بچی مسلمان ہیں۔ پانچویں وقت اللہ کو سجدہ کرتی ہیں۔ پھر اتنی صلاحیت تو آپ میں ہوگی کہ جھوٹ اور سچ میں تمیز کر سکیں کہ اللہ کو گواہ بنا کر جھوٹ تو نہیں بولا جاسکتا۔“

”اگر یہ سچ ہے تو آپ مجھے یہیں اتار دیں۔ میں گھر چلی جاؤں گی۔ آپ کے دشمنوں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“

”اب یہ ممکن نہیں ہے۔ ہم کراچی کی حدود چھوڑ کر سندھ کی آخری حدود میں داخل ہو چکے ہیں اور ہمارا یہ سفر کئی گھنٹوں پر مشتمل ہے۔ آپ کو بے ہوشی کے دوران محسوس نہیں ہوا۔“

”آف! لیکن مجھے یہاں نہیں رہنا۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ اس نے

رہا تھا۔ شانزل خان تو فوراً ہی لاک کھول کر وہاں سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ بھی گھبرا کر اندر سے گیٹ کی سمت بڑھی تھی۔ دو قدم بجل کر ہی نہ معلوم کس شے سے ٹکرائی اور سیدھی منہ کے بل گر گئی۔ سر کی ٹوک وار چیز سے ٹکرایا تھا۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ لمبے بھر میں وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی۔

نہ معلوم کتنا وقت گزرا تھا، جب اس نے آنکھیں کھولیں تو پہلا احساس یہ جاگا کہ وہ لیٹی ہوئی ہے اور بیڈ مسلسل گردش میں ہے۔ یہ احساس عجیب سا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھی تھی اور اس طرح بیٹھنے سے اس کے سر کے زخم میں ٹھیس اٹھنے لگی تھیں۔ لیکن اس نے اس کی پرواہ نہ کی۔ وہ جس صورت حال سے اس وقت دوچار تھی، اس نے اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑا دی تھی۔ وہ جسے بیڈ سمجھ رہی تھی، وہ بیڈ نہیں بلکہ کار کی پچھلی سیٹ تھی۔ کار مسلسل گھوم رہی تھی۔ فرنٹ سیٹ پر شانزل خان کان سے موبائل لگائے کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔ اُسے اٹھتے دیکھ کر موبائل اس نے آف کر دیا تھا اور اس کی طرف جھک کر خاصی اپنائیت سے گویا ہوا۔

”پلیز..... آپ لیٹی رہیں۔ سر میں آپ کے خاصی چوٹ آئی ہے۔“

”نہ..... یہ آپ کہاں لے کر جا رہے ہیں مجھے؟ کیا..... کیا مقصد ہے؟“ بے شک وہ ہائیکس سالہ زندگی میں کراچی سے باہر کبھی نہیں گئی تھی لیکن اتنا فہم و ادراک رکھتی تھی کہ ہر صوبے کی ثقافت و علاقائی جغرافیہ سے واقف تھی۔ شیشوں سے باہر نظر آنے والے وہ گرم دہکتے سورج سے روشن ہوتے مناظر صوبہ سندھ کے لگ رہے تھے۔ یعنی وہ کراچی کی حدود سے باہر آچکے تھے۔ اب نہ معلوم کس طرف جانے کا اس کا ارادہ تھا۔

”شہر کے بنگاموں سے دور پڑ سکون جگہ چل رہے ہیں ہم۔“ اس کا پڑ سکون لیجہ قابل دید تھا۔ کار میں فل اسے ہی کوئلے کے باوجود اس کی رگ رگ میں انگارے دہکتے لگے۔ سرتاپا وہ پسینے میں شرابور ہو گئی۔ یہ احساس ہی وحشتوں میں بھونکانے کے لئے کافی تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس کی اجازت اور مرضی جیسے کوئی حیثیت ہی نہ رکھتی تھی۔

وہ اتنا غرور اور بے باک تھا کہ کار میں موجود ڈرائیور کی رتی بھر بھی پرواہ نہ تھی اسے۔
 ”شرافت سے بیٹھ جاؤ۔ اس وقت میں ڈسٹرب ہوں۔ کوئی حماقت برداشت نہیں
 کروں گا۔“ ایک جھٹکے سے شانزل خان اس سے الگ ہو بیٹھا تھا اور ساتھ ہی سخت لہجے
 میں تنبیہ بھی کی تھی۔

باقی رات سکون سے ملے ہوا۔ خضریٰ نے اس کی بے باک فطرت سے خائف ہو کر
 مزید کسی مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیا اور خاموشی سے دل ہی دل میں فرار کے منصوبے
 بنانے لگی۔ وہ بھی اسے خاموش ڈپر سکون دیکھ کر اطمینان سے بیٹھ گیا تھا۔

شام ڈھلے کار کے کچے راستوں سے گزر کر سرخ اینٹوں سے بنی وسیع و عریض حویلی
 کے گیٹ پر ٹوکی تھی۔ گیٹ سے باہر ہی کافی لوگ ان کے استقبال کو موجود تھے۔ سفید
 براق سنوں میں ملبوس رنگ برنگی اجڑک لپٹے، رنگین کڑھائی والی شیشوں کی ٹوپیاں
 اوڑھے، لمبے چوڑے لوگ جن کے بھاری بھر کم چروں پر دور سے ہی نظر آتی سیاہ اور
 بے ہنگم مونچھیں خوفناک لگ رہی تھیں۔ اس کے دل میں کسی نئے خوف نے جگہ بنائی۔
 کار رکھتے ہی دو سب تیزی سے آگے بڑھے تھے۔ شانزل خان بڑی گرم جوشی سے
 ان سے گلے ل رہا تھا۔ ڈرائیور ایک جانب مودبانہ انداز میں کھڑا تھا۔ ان لمحات میں وہ
 جیسے منظر سے اوجھل ہو گئی تھی۔ پھر شانزل کو بھی اس کا خیال آیا تھا۔ اس نے قریب
 کھڑے ڈرائیور کو کچھ حکم دیا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اس کی ہمراہی میں حویلی کے اندر داخل
 ہو گئی تھی۔

”کیا بات ہے بابا! کچھ اُکھے اُکھے پریشان سے دکھائی دے رہے ہو۔ خیر تو ہے نا
 سائیں؟“ رات کو کھانے سے فراغت کے بعد وجاہت علی سومرو جو اس علاقے کا ڈیرہ
 اور اس کا خاص دوست تھا، چٹائی پر ہی متنفس انداز میں استرخار کرنے لگا۔
 ”نہیں۔ زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔“
 ”سائیں! زیادہ اور کم کیا، پریشانی تو پریشانی ہوتی ہے اور ہمارے یار بھائی ہمارے

بچرے ہوئے لہجے میں کہا۔
 اس لمبے شانزل خان نے کچھ برہمی کی نگاہ سے اُسے دیکھا پھر سر دھچکے میں کہنے
 لگا۔ ”بیوقوفی کی باتیں مت کرو، جو میں نے کہا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”بیوقوفی کی بات آپ کر رہے ہیں یا میں؟ میری اس طرح گھر سے غیر حاضری
 میرے لئے کیا مشکلات کھڑی کر سکتی ہے، کس طرح سے وسوسیاں میرا آجکل داغدار کر
 سکتی ہیں، آپ کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ بلکہ آپ کی پلاننگ میں تو یہ شامل ہے۔“
 ”اوہ شٹ! بدگمانی کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ لیکن تم ہر انتہا عبور کر چکی ہو۔ تم سے
 کچھ کہنا یا سمجھانا پتھر سے سر پھوڑنے کے مترادف ہے۔ لہذا خاموش رہو تو بہتر ہے۔“
 اس نے سختی سے کہتے ہوئے رخ پھیر لیا تھا۔

”مجھے آپ یسٹیں اتار دیں ورنہ میں چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گی۔“ اس بار
 اس کے لہجے میں وحشت جوں کچھ اس انتہا کو تھا کہ چند ساعت شانزل خان نے اس کی
 طرف گھور کر دیکھا پھر ڈرائیور کو کار روکنے کا کہا۔ کار رکتے ہی وہ برق رفتاری سے فرنٹ
 ڈور سے اتر کر بیک ڈور کھول کر اس کے برابر بیٹھ گیا اور ڈرائیور نے کار دوبارہ ڈرائیو
 کرنا شروع کر دی۔ اُس کی برق رفتاری پر وہ بھونچکا رہ گئی۔

”تم حد درجہ بددعا ہی نہیں بلکہ احمق بھی ہو۔“ اس کے برابر میں بیٹھ کر وہ غرایا
 تھا۔ خضریٰ حیات اس کے اس طرح بیٹھنے سے غیر ارادی طور پر دو کھٹک جاتی تھی۔
 ”دور کیوں جاتی ہو تم یہی تو یہ بتی تھیں کہ میں قریب۔“ قریب پنجوں تو پھر یہ
 اعتراض کیوں؟“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اُسے خود سے قریب کر لیا۔

”چھوڑ نہیں مجھے۔ چھوڑو، چھوڑو مجھے۔“ اس کے بازو کے گھیرے میں وہ تڑپ
 کے رہ گئی۔ اس کے مضبوط بازو کی گریٹ بھی کچھ ایسی ہی تھی جیسے فولادی ٹکڑو۔

”بہت دیکھے ہیں ایسے ننگ۔ بس قسم کرو نا اب۔ بہت ہو چکا۔“ اس نے جھک
 کر سرگوشی کی۔ خضریٰ کے چہرے کو اس کی سانسیں جھلسانے لگیں۔ اس کے لبوں سے
 چمکتی نگاہوں کی مہک سر پکڑانے لگی۔

”تم ابھی تک ایسے ہی ہو، درگزر سے کام لینے والے۔ ٹھیک ہے بابا ٹھیک ہے۔ یہ جتاؤ، رات کا کیا پروگرام ہے۔ کسی ”ایڈجسٹ گیسٹ“ کا انتظام کریں یا.....“ وجاہت سومرو نے پائیس آنکھ دہاتے ہوئے مخصوص لہجے میں بات اور حوری چھوڑ دی۔

”فی الحال کسی گیسٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ریسٹ کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہا..... ہا..... تمہاری ٹھکن اتارنے کا سامان تیار کیا ہوا ہے میری جان! ڈیرے پر چلو، رنگ و سرور کی محفل بھی ہوئی ہے۔ تحریر کیا تیس خنجر ہیں ہماری۔“

”سرکار! وہ مہمان بہت غصے میں ہیں اور کچھ کھانا نہیں رہی ہیں۔“ اسی دم ایک ملازم نے آکر اطلاع دی۔

”اچھا تم جاؤ۔“ وجاہت علی سومرو نے شانزل خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ملازم کے جانے کے بعد معنی خیز لہجے میں بولا۔

”کیا چکر ہے؟ تم عورتوں کے خڑے کب سے برداشت کرنے لگے؟“

”اس بار خاصی چکر باز لڑکی نکرائی ہے۔ اپنی دے، وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنے خول سے نکل آئے گی۔“ جواباً اُس نے بھی معنی خیزی سے کہا تھا۔

”ہاں سائیں! بعض لڑکیوں کی عادت ہوتی ہے فضول خڑے دکھانے کی۔ مگر زیادہ لفٹ نہ ملے تو اپنی اوقات پر جلد ہی آ جاتی ہیں۔“ نہ معلوم کس جذبے کے تحت شانزل نے اسے ناگواری سے گھورا تھا۔ وہ گزیرا سما گیا۔

”پھر چل رہے ہو نا ڈیرے پر؟“

”نہیں، تم جاؤ۔ یہ میرے عہد کا معاملہ ہے۔ جب تک میں اس بد و ماغ اور گھمنڈی لڑکی کا غرور پاش پاش نہیں کر دیتا تب تک ہر رنگینی سے دور رہنے کا عہد کر چکا ہوں۔“

”پھر تو وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہو سکتی جس نے شانزل خان آفریدی کو صرف اپنا پابند کر لیا۔ یقیناً وہ ایک عالم کو فتح کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔“

”بی بی جی اللہ کے واسطے زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی کھا لیجئے۔ کل سے آپ نے کچھ نہیں

زبردہ رہتے ہوئے پریشان ہوں یہ ہمارے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔“ وجاہت سومرو نے اپنی موٹی موٹی مونچھوں کو تاد دیتے ہوئے ناراض لہجے میں کہا۔

”تم بے فکر ہو یا! میں ایسے پرائیمر خود پینڈل کرتا رہتا ہوں۔“

”پھر بھی کچھ مظلوم تو ہو، کیا معاملہ ہے؟ تم اس طرح میرے غریب خانے پر آنے والے تو نہ تھے۔“

”خرم انڈسٹریز کے نام سے تو واقف ہو گئے نا۔ پچھلے سال سے ڈیڈ کا اس سے معاملہ چل رہا ہے۔ اس کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ برنس ورلڈ میں شانزل انڈسٹریز کی ویلیو زیرو لیول پر آ جائے۔ اپنے سب ہتکنڈوں میں ناکام ہونے کے بعد وہ لوگ اب میرے جانی دشمن بنے ہوئے ہیں۔ کل رات بھی اچانک ان لوگوں نے بیچلے پر ایک کر دیا تھا۔ ڈیڈ کی ہدایت کے مطابق مجھے ابھی چند دن اس شہر سے دور رہنا ہے سو میں تمہارے پاس چلا آیا اور کل آگے جانے کا پروگرام ہے۔“ شانزل نے اُسے تسلیاً حالات سے آگاہ کیا۔

”پہلے کیوں نہیں آگاہ کیا ان حالات سے؟ وجاہت سومرو کے دوست کا دشمن اس کا دشمن ہوتا ہے۔ بے فکر رہو، کل ہی تمہارے دشمن منہ ہستی سے مٹ چکے ہوں گے۔ میرے بندے.....“

”نہیں پلیز، تم بھی وہی کام کرنے جا رہے ہو جو ڈیڈ کرنا چاہتے تھے۔“ اُس نے وجاہت سومرو کی بات کاٹ کر سرد لہجے میں کہا۔

”کیا تم اپنے دشمنوں کو ایسے ہی چھوڑ دینا چاہتے ہو؟“

”کم ظرف اور بزدل لوگوں کی پرچھائیوں سے بھی مجھے نفرت ہے۔ بہادر وہی ہوتے ہیں جو سامنے آکر وار کرتے ہیں اور مقابلے کی ہمت رکھتے ہیں۔ بزدل لوگوں سے میں دشمنی یا دوستی کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر یہی سب کرنا ہوتا تو میرے پاس بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اشارہ پاتے ہی جان لینے اور دینے کی ہمت و حوصلہ رکھتے ہیں۔“

کھایا۔ اس طرح آپ کی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔“ ڈرائیور نے نہایت عاجزی سے دسویں بار اس سے درخواست کی جو کمرے میں از حد خراب موڈ لئے بیٹھی تھی۔

”جسبیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کھٹیا انسان۔ آج تمہاری وجہ سے ہی میں یہ منحوس گھڑی دیکھنے پر مجبور ہوں۔ شتم دروازہ باہر سے لاک کر کے جاتے اور نہ میں اس طرح در بدر ہوتی۔ اپنے مالک کے ساتھ گناہ میں تم بھی برابر کے حصے دار ہو۔“ اُس کے لہجے میں زہریلی زہر تھا۔

”دروازہ باہر سے لاک نہیں تھا بلکہ وہ اندر سے بند کر دینے سے کھل جاتا ہے۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں، جو مالک حکم دیں اسے بجالاتا ہی ہمارا فرض ہے۔“

”ایسی دہائی کی روٹی کھلانے سے بہتر ہے تم اپنے بیوی بچوں کو زہر دے کر مار دو۔ تم کیسے مسلمان ہو؟ تمہارا ضمیر کبھی ملازمت نہیں کرتا اس گھٹیا نوکری پر؟“

”نور محمد!“

”جی صاحب۔“ ڈرائیور شانزل خان کی آواز سن کر بوکھلا کر سڑا۔ وہ نہ معلوم کب وہاں آکھڑا ہوا تھا۔ ان دونوں کی اس طرف پشت تھی۔

”جاؤ۔“ اُس کا لہجہ بے تاثر اور سپاٹ تھا۔

”کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہیں آپ؟“ ڈرائیور کے جانے کے بعد وہ اس کے قریب چلا آیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی طرح اکھڑی اکھڑی کھڑی رہی۔

”میں آپ سے مخاطب ہوں۔“

”مرضی میری۔“ اُس کے ہر انداز میں ہٹ دھرمی اور حقارت تھی۔ شانزل خان کا دماغ ایک دم ہی آلت گیا۔ وہ کب ایسے لہجے سننے کا عادی تھا اور نہ ایسے تیور دکھانے کی کوئی اسے خواب میں بھی جرأت کر سکتا تھا۔ پھر یہ بے حیثیت، کمزور سی لڑکی بار بار اس کی عزت نفس پر، اس کے چہرہ پر ضربیں لگا رہی تھی۔ آخر برداشت کی بھی کوئی انتہا تھی۔ وہ کبھی کسی کا رعب برداشت کرنے کا عادی ہرگز نہ تھا۔

”کیا کہا؟ پھر سے کہو۔“ اُس کے لہجے میں غراہٹ تھی۔ شدید ترین۔

”شانزل خان آفریدی! میں نے کہا، مجھے بھوک نہیں ہے اور میری مرضی۔ مجھے اختیار ہے کہ میں جو اپنے لئے بہتر سمجھوں وہی کروں۔“ وہ اس سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئی تھی۔

”نہیں، اس وقت تم میرے اختیار میں ہو اور مرضی صرف میری چلے گی، سمجھیں؟“ اُس نے خنثی کا بازو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔

”ہرگز نہیں۔ تم مجھے یہاں اپنی مرضی سے لے آئے ضرور ہو، مگر اب تمہارے اختیارات کی حدود ختم ہو چکی ہیں۔“

”اختیارات!“ اُس نے زہریلا تبقہ لگایا۔ پھر اس کے شانوں پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ دیتا ہوا بولا۔ ”جہاں سے میرے اختیارات کی حدود شروع ہوتی ہیں وہاں ”اخلاقیات“ کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔“ اُس نے بے باک نگاہوں سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری نام نہاد پاک بازی کی بقا کے لئے لازمی ہے کہ مجھے جیتنے کے دھڑکنے پر مجبور مت کرو۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ مرد جب وحشی بنتا ہے تو ساری قسموں، سارے وعدوں سے نا بلند و بے بہرہ ہو جاتا ہے۔“ خنثی کو لمحے بھر میں احساس دلا دیا کہ وہ ایک کمزور و ناتواں لڑکی ہے جو زبان کی کاٹ سے تو اس مرد کو زیر کر سکتی ہے مگر جسمانی لحاظ سے وہ ایک چوٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس جیسے بھرپور طاقت رکھنے والے شخص کے بازو بھی اپنے شانوں سے ہٹانے کی طاقت اس میں نہ تھی۔

”اُنبہ..... مجھے گائیڈ کرنے کی کوشش مت کرنا۔“ اُس نے دھکا دے کر اسے راستے سے ہٹایا تو وہ صوفے پر جا گری۔

”کھانا کھاؤ..... یا میرے ہاتھ سے کھانا پسند کرو گی؟“ اُس کے اشتعال بھرے انداز میں یکگفت شوخی ابھر آئی تھی۔ اُس کے مزاج میں حد درجہ حاکمیت تھی۔ ایسے شاہانہ مزاج کے لوگ کسی دوسرے کو برداشت کرنے کا ظرف قطعی نہیں رکھتے۔ وہ چھوٹی عمر سے صرف ہاں سنتا آیا تھا۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ کچھ کہہ سکے۔

پہلی بار خضر کی حیات نے اسے انکار کی اذیت سے روشناس کرایا تو وہ اسے اپنے لئے چیلنج سمجھ بیٹھا۔ اس وقت اس کے خود پسند جذبے کو بہت تقویت و طمانیت کا احساس ہوا جب وہ فخر و افتخار سے چلنے والی لڑکی اس کی معمولی سی قربت سے ہم کر کانپ اٹھی تھی۔ اس کے چہرے کے اڑتے رنگ کو دیکھ کر اس کی مردانگی کا سینہ فخر و غرور سے بلند تر ہو گیا۔ اٹا و انتہا پسندی باغ باغ ہو گئی تھی۔

”کیا ارادہ ہے؟ کھانا ہے میرے ہاتھ سے؟“ اس کی خاموشی محسوس کر کے وہ دوبارہ شوخ ہوا۔

”پلیز، مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ میں تنہائی چاہتی ہوں۔“ اپنی ذات کی کمزوری کا احساس، لہجے کا کھوکھلا پن خود اسے صدمے سے بے حال کر گیا۔

”اوکے۔ فائنٹ کھانا کھاؤ۔ کچھ دیر بعد نور محمد کو بھیج رہا ہوں برتن لینے کے لئے۔ اگر کسی چیز کی خواہش ہو تو کہو۔“ وہ دروازے کے قریب ٹک کر گویا ہوا۔

”نی الوقت تنہائی، صرف تنہائی۔“

لحہ بھر وہ اسے بغور دیکھتا رہا پھر گڈ ٹائٹ کہتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس نے اندر سے کنڈی لگائی اور چھوٹی میز پر رکھے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ از حد پریشانی و تفرات کے باعث زیادہ نہیں کھایا گیا۔ پانی پی کر وہ بند پر آ کر لیٹ گئی۔ سر کا زخم درد کرنے لگا تھا۔ کچھ دیر وہ سر پر ہاتھ رکھ کر لیٹی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اضطراب زیادہ ہی بڑھا تو اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ اسے یہاں سے فرار ہونا تھا اور یہ کام رات کی تاریکی میں ہی درست طریقے سے ہو سکتا تھا۔ شانزل کی نگاہوں میں ہوس کا رقص وہ دیکھ چکی تھی۔ وہ شخص کبھی بھی انسانیت و اخلاقیات کے لیادے سے آزاد ہو سکتا تھا اور وہ یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس کی ہوس سے داغدار ہونے سے بہتر موت کو گلے لگا لینا ہے۔

جس وقت نور محمد کھانے کے برتن لینے آیا، اس نے پلان کے مطابق بھر پور خیند سے جانگنے کی اداکاری کی۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے دروازہ کھول کر جہائی لینے ہوئے اسے ڈانٹا۔

”وو.....وو..... کھانے کے برتن لینے تھے۔“ نور محمد اس سے از حد خوفزدہ رہتا تھا۔

”صبح نہیں لینے آسکتے تھے؟ سخت نیند سے جگا دیا۔ لے جاؤ برتن۔“

صاحب نے یہ دودھ اور ٹیبلٹ دی ہیں۔ انہیں بھی کھالیں۔“ وہ دودھ سے بھرا جگ اور ٹیبلٹ تپائی پر رکھ کر آہستگی سے بولا اور کھانے کے برتن اٹھا کر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ اس نے ٹیبلٹ پانی سے کھائیں اور کچھ دیر بعد لیٹ گئی۔

رات کی سیاہی پوری طرح کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ تاریکی میں لپٹی ہر چیز خوفناک اور پراسرار لگ رہی تھی۔ وہ دیے دیے قدموں سے نہایت احتیاط سے آگے بڑھ رہی تھی۔ باہر نکلنے سے قبل اس نے اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ یہ حویلی گیٹ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتی تھی یا دوسرے معنوں میں ان کی عیاشیوں کا اڈہ تھی۔ وہاں کوئی عورت نہیں تھی۔ صرف چند ملازم تھے۔ کمرے بھی زیادہ تر لاکھڑے تھے۔

ہر سو اندھیرا تھا۔ صرف راہداری میں ایک ٹائٹ بلب کی زرد روشنی ماحول کو مزید خاموشی اور وحشت ناک بنا رہی تھی۔ گیٹ کے پاس چوکیدار چار پائی پر لیٹا بے فکری سے خراٹے لے رہا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑی چوکیدار کو بغور دیکھتی رہی کہ اس کی نیند کتنی تو نہیں۔ جب اطمینان ہو گیا کہ وہ کئی نیند سو رہا ہے تو ہاتھ بڑھا کر ٹیکے کے نیچے رکھی چابیوں کے سمجھے کو اٹھا تاہی چاہتی تھی کہ معاہذا محسوس ہوا جیسے اندر سے کوئی آ رہا ہو۔ وہ فوراً درخت کی آڑ میں ہو گئی اور وہاں اندھیرے میں چپکتے شخص سے جتنو کو دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ ایک مخصوص زاویے سے اٹھتی گرتی سگریٹ کا شعلہ تھا جو اندھیرے میں جتنو کی مانند چمک رہا تھا۔ بغور دیکھنے پر وہ شخص بھی نہایت اطمینان سے کھڑا دین نظر آ گیا۔ گویا اسے یقین تھا کہ وہ یہاں ضرور آئے گی۔ سوائنگ کی گھڑیاں گمن رہا تھا۔

”ہیلو، مجھے معلوم تھا تم یہ احتمالہ حرکت ضرور کر دو گی۔“ وہ قریب آ کر گویا ہوا۔

”آپ کو اپنے علاوہ سب احسن اور بے وقوف نظر آتے ہیں۔“ اپنی شدید ناکامی پر زبان پر قتل ڈالنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ چنانچہ جھجلا کر طعنیہ لہجہ میں بولی۔

”نہیں۔ جوہوتے ہیں صرف وہ۔“ وہ بھی دل جلانے والی باتیں مزے سے کرتا تھا۔
 ”اؤنہہ.....“

”یہ اؤنہہ اور اوس ہوں سے کام نہیں چلے گا۔ چلے اندر انتہائی فیصلے کرنے سے قبل
 تھوڑا عقل کو بھی زیرِ استدلال لے آیا کریں جو نہ معلوم کب سے رنگ آلود ہو رہی ہے۔“
 وہ اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کمرے میں لے آیا تھا۔

”تمہارے عزائم تو میں اسی وقت بھانپ گیا تھا جب تم کھانے سے انکار کر رہی
 تھیں۔ نور محمد نے بتایا کہ تم نارمل ہو گئی ہو بلکہ گہری نیند سے بیدار ہوئی تھیں تو میرے
 شک کو مزید تقویت ملی۔ سوچنے کی بات ہے، ایک لڑکی جو اپنی مرضی کے بغیر لائی گئی ہو،
 جو کئی گھنٹے بھوکے ہونے کے باوجود کھانے کو اہمیت نہ دے رہی ہو بھلا ایسی حساس و
 ضدی لڑکی درپیش آنے والے اندیشوں سے بے فکر ہو کر کیسے سو سکتی ہے۔ تو..... تو.....
 امپائل۔ نور محمد جیسا محمد و سوج اور ذہین رکھنے والا بندہ اس فریب کے چال میں پھنس
 سکتا ہے مگر شانزل خان جو ایک دنیا کو فریب دے سکتا ہے اسے فریب دینا قطعی ناممکن
 ہے۔“ اُس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ کرسی پر بیٹھی دانتوں سے ہونٹ کاٹتی رہی۔ اس وقت غم و غصے سے
 اس کی بری حالت تھی۔ منزل کے قریب پہنچ کر تاکام ہو جانا اذیت ناک ترین عمل تھا۔

”بائی دادو، اس وقت آپ کہاں جانے کا ارادہ رکھتی تھیں؟“

”کہیں بھی۔ لیکن اس جہنم سے ہزاروں میل دور۔“

”گویا باہر تو جنت کے باقی ہاتھوں میں پھول لئے آپ کی آمد کے منتظر ہوتے۔“
 اُس کا لہجہ سو فیصد چڑانے والا تھا اور وہ بری طرح چڑی گئی تھی۔

”بے شک۔ آپ کے مقابلے میں ان میں انسانیت و شفقت تو ہوتی۔“

”یہی تو تم میں امتحان پنا ہے۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”یہ دنیا ایسے لوگوں سے
 بھری پڑی ہے جو عورت کو محض کھلونا سمجھتے ہیں۔ اور تم رات کی تاریکی میں نکل رہی تھیں۔
 ایسے دہانوں میں تنہا لڑکی کا مل جانا ایسا ہی ہے جیسے اصول بھرا پڑا مل جائے۔ اور

سوٹ ہارٹ! بہت کم لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جو اپنے عہد کی پاسداری اور ان کی
 سرخروئی کی خاطر دریا کے قریب ہوتے ہوئے بھی باوجود پیاس کے خود کو ہیراب کرنے
 سے باز رکھتے ہیں۔“ اس کے دنیہ پر چہرے پر جذب کی سرخی چھانے لگی تھی۔

”مجھے ان دہلیات ناموں سے نہ پکاریں تو مہربانی ہوگی۔“

”پھر نیک پروین یا ملانی جی کہہ کر پکاروں؟“ وہ شکست کھانے والوں میں سے نہ تھا۔
 ”مجھے کسی بھی نام سے پکارنے کی زحمت گوارا نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ اور آپ
 یہاں سے چلے جائیں۔“ وہ جھنجھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”اوکے۔ مجھے امید ہے اب دوبارہ تم یہ غلطی دہرانے کی کوشش نہیں کروگی۔ اگر دل
 نہ مانے تو خود کو چودہ انگلیشن لگوانے کے لئے تیار کر کے باہر نکلے گا سوچنا۔ کیونکہ باہر
 اس وقت دجاہت سومرو کے شکاری کتوں کی حکومت ہے۔ پہلے میں نے منع کر دیا تھا۔“
 وہ مسکراتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازے کی اندر سے کڑی لٹکی اور آ کر
 بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔ باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آواز کمرے تک آ
 رہی تھی۔

کیا زندگی ہے میری۔ عذاب و عذاب کے بھنور میں چکراتی ہوئی۔ ایک پریشانی
 ختم نہیں ہوتی کہ دوسری اپنے بیچوں میں جکڑ لیتی ہے۔

مجھے بہت زیادہ چاہ تو نہیں۔ صرف عزت کی پردہ کار زندگی، طمانیت بھری تھوڑی سی
 خوشحالی کی ہی تو چاہ تھی۔ مجھے سوائے مسعود برحق کے کسی بشر کے آگے اپنا ہاتھ پھیلا نا نہ
 پڑے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جو لوگ شکر کرتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے انہیں
 صرف شکر ہی میسر ہوتا ہے۔ پریشانیوں میں وہ دھستے چلے جاتے ہیں۔ اور جو رب کا شکر
 کرنا نہیں جانتے، وہ سر سے پاؤں تک ہر لمحہ، ہر ساعت کرم نوازیوں میں بھیکے رہتے
 ہیں اور ایک وقت میں خدائی کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں۔ قسمتوں میں اتنا تضاد کیوں ہوتا ہے؟
 اتنا ہی کہتی ہیں، ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اللہ جو کرتا ہے بندے کی بہتری کے لئے
 کرتا ہے۔ ہمیں اس سے شکوہ کرنے کا بالکل بھی حق نہیں ہے۔ ہم کون سے ان کے

حقوق و احکامات کی بجا آوری و پابندی سے کر رہے ہیں۔ پانچ وقت سجدے کرتے ہیں تو سر سجدے میں ہوتا ہے اور من میں اپنے مسائل اور دنیا کی باتیں اُدھم مچاتی ہیں۔ ششور و حضور ہماری نمازوں سے غائب ہو چکا ہے۔ قرآن کو بھی ایک کتاب کی طرح پڑھا، چوما اور چمکدار جزدان میں لپیٹ کر سب سے اونچی جگہ پر رکھ دیا۔ بس یہی تفہیم ہماری نگاہوں میں ہے۔ کبھی اسے سمجھ کر پڑھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش ہم نے نہیں کی۔ ہم تو شکوہ شکایت کرنے کے بھی مجاز نہیں ٹھہرائے گئے۔

اب بھلا ہم جیسے نصیب کے مارے لوگ کہاں جائیں؟ کس سے انصاف طلب کریں؟ میں نے اپنی زندگی میں مرد کو کسی حوالے سے نہیں دیکھا تھا۔ باپ میری پیدائش سے دو ماہ قبل ایک روڈ ایکسڈنٹ میں مجھے شکم مادر میں ہی تھیں کی چادر اوڑھا کر چلے گئے تھے۔ پہلی اور آخری اولاد ہونے کے باعث مرد کے اس رشتے سے بھی سابقہ نہ پڑا جو بھائی کہلاتا ہے۔ رشتے داروں میں سوائے انانی کے کوئی دوسرا رشتے دار نہ تھا۔ ماں کی کھوکھ میں ہی مجھ پر مصیبتوں اور پریشانیوں کے کبھی نہ ختم ہونے والے سائے پڑ چکے تھے۔ بچپن میرا بالکل اسی مفلسی میں گزرا جیسا ایک غریب و یتیم بچی کا گزرتا ہے۔ امی اور انانی کورات دن مشین پر جھکا دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش جڑ پکڑ چکی تھی کہ پڑھ لکھ کر مجھے اچھی سی چاب کرنا ہے اور ان دونوں کے تمام دکھ درد سمیٹ لیتا ہے۔ کبھی عام بچوں کی طرح گلیوں میں نہیں کھیلی اور نہ ہی میری کوئی سہیلی تھی۔

میری دوستی کورس کی کتابوں سے تھی اور اس دوستی نے ہر کلاس میں مجھے ٹاپ پوزیشن دلائی تھی۔ میٹرک کے بعد جب میں نے کالج میں فرسٹ ایئر میں ایڈمشن لیا تو ساتھ ہی گھر میں ٹیوشن سینٹر کھول لیا۔ اس طرح خرچے کا بندوبست ہو گیا تھا۔

امی کی طبیعت بھی اب کافی دنوں سے درست نہیں رہتی تھی۔ بخار اور کھانسی کی شکایت اکثر رہنے لگی تھی۔ پھر جب خواب کی تعبیر ملنے کے دن آئے تو امی نے اپنا فیصلہ سن کر ایک ہی ضرب سے سارے خواب چٹکنا چور کر ڈالے۔ وہ ماضی میں کھو گئی! "شادی؟ لیکن امی، میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ میں نے گریجویشن اس لئے

نہیں کیا کہ ہاتھ پیلے کر کے آپ کو بے سہارا چھوڑ کر چلی جاؤں۔ ابھی میرے بہت سے خواب اصورے ہیں۔ مجھے بیٹا بن کر آپ کی خدمت کرنی ہے، آپ کا بوجھ اٹھانا ہے۔ آپ نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں میری خاطر۔ اب مجھے خدمت کرنی ہے آپ کی اور انانی کی۔ میں نے دو جگہ اپلائی کیا ہے ملازمت کے لئے۔ آج کل میں جواب آ جائے گا۔"

"ہمیں تمہارے سہارے کی ضرورت نہیں ہے بیٹی! صرف اللہ کا سہارا درکار ہے۔ ہمارے ہاں لڑکیوں سے نوکری کروانے کا رواج نہیں ہے اور نہ ہی تمہیں اس خیال سے تعلیم دلوائی ہے کہ تمہاری کمائی پر ہم گزارہ کریں گے۔" امی کے نرم لہجے میں بھی ترشی شامل تھی۔

"امی! یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ کیا آپ دونوں نے گھر بیٹھ کر محنت نہیں کی؟" "گھر بیٹھ کر محنت کرنے اور باہر نکل کر کام کرنے میں بہت فرق ہے بیٹی۔ یہ وقت بہت خراب ہے، اس دور میں بہن، بیٹی جیسے معتمد و پاکیزہ رشتے کم طرف لوگوں کی گندی ذہنیت سے اپنا مقام کھو چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتی میری بیٹی کسی کی گندی نگاہوں کا نشانہ بنے۔ میری آرزو یہی ہے کہ تم عزت و آبرو سے ہماری دعاؤں کے سنگ اپنے اصل گھر سدا رہو۔"

"لیکن امی! میں اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔" اس کی فطری ضد عود کر آئی۔ بھلا اس دن کے لئے اس نے تعلیمی میدان میں سخت ترین جدوجہد کی تھی کہ جب کچھ کر دکھانے کا موقع آئے تو وہ عام لڑکیوں کی طرح گھونگھٹ میں منہ چھپائے ایک انجان شخص کے ہمارو ان دونوں کو بے آسرا چھوڑ کر چلی جائے اور اپنی زندگی میں مست ہو جائے۔ وہ اتنی خود غرض و موق پرست نہیں تھی۔ اس کی زندگی کا مقصد انہیں صرف اور صرف خوشحال زندگی دینا تھا۔ خود کو مٹا کر انہیں خوشیاں اور سکھ دینا تھا۔

ان دونوں کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ اپنے انکار پر قائم رہی تو امی نے اپنی بات منوانے کے لئے بھوک ہڑتال کر دی۔

جائے گی۔ اسے سوچے سمجھے کے لئے کچھ وقت دو۔ یہ تمہارا خون ہے۔ بھلا تمہارے فیصلے سے انحراف کا حوصلہ کر سکتی ہے؟“ انابی انہیں سمجھاتے ہوئے خود بھی رو پڑی تھیں۔ وہ ان کے پاس بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

”سب جتن کرنے کے بعد بھی آپ اس کے حوصلے کی بات کر رہی ہیں انابی۔ حیرت ہے، اسے میری نہیں اپنی پرواہ ہے۔ ماں کا فیصلہ اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں ماں نہیں دشمن ہوں اس کی۔ اس کے لئے برا چاہوں گی تا۔ مر جانے دو مجھے۔“

”امی..... امی! آپ ایسا نہ کہیں۔ مجھے آپ کی بات منظور ہے آپ کے ہر فیصلے پر میں جان لٹانے کو تیار ہوں۔ آپ جو کہیں گی میں کرنے کو تیار ہوں۔“ وہ روتی ہوئی ان سے پلٹ گئی تو انہوں نے بھی روتے ہوئے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

”میں کہتی ہوں لڑکے کی عمر کافی ہے۔ ہماری خضریٰ کے ساتھ اس کا جوڑ مسج نہ رہے گا۔“ وہ شام کی چائے بنا رہی تھی جب انابی کی دبی دبی آواز من سے سنائی دی۔

”آپ نے بھی اتنی عمر کہاں گنوائی ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے، بڑی عمر کے مرد و جوان و حسین بیوی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اشاروں پر ناپتے ہیں۔ اور جوڑ والے مرد تو لانا بیویوں کو کینرہ کر رکھتے ہیں۔ رات دن خدمت کرتی ہیں لڑکیاں تب بھی وہ توجہ و محبت نہیں پاتیں جو ایسے مرد دیتے ہیں۔ دیکھنا رافع فیاض خضریٰ کو رانی بنا کر رکھے گا۔ میری بچی وہاں ہر وہ سکھ دیکھے گی جو ہم بد نصیب اسے نہ دے سکے۔“ قاخرہ کے لہجے میں گزری محرومیوں کے عکس میں آنے والے سنہری مستقبل کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔

چائے گموں میں نکالتے وقت اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ اس کے اور امی کے جذبے میں ایک قدر مشترک تھی کہ اگر وہ ان کے بہتر دنوں کی خواہش رکھتی تھی تو وہ بھی اس کے بہترین مستقبل کے لئے کوشاں تھیں۔

”اچھی طرح معلومات تو تم نے حاصل کر لی ہیں تا رافع فیاض کے بارے میں؟“

انابی کسی طور مطمئن دکھائی نہ دے رہی تھیں۔

”ہاں..... ہاں۔ حاجی صاحب کا دیکھا بھالا ہے۔ انہوں نے ضمانت دی ہے۔ بے

گھر میں ویرانی و اداسی پال بکھرائے گھومتی تھی۔ انابی ان دونوں ماں بیٹی کو سمجھانے میں ہر طور کا کام رہی تھیں۔ پورا ایک دن گزر گیا تھا۔ اسی نے پانی تک نہ پیا تھا۔ بخار کی شدت نے انہیں پھر آن گھیرا تھا اور کھانسی نے ایک ایک جوڑ ہلا ڈالا تھا۔

”امی! اتنا اہلکی مجھ سے ہے۔ پھر آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہیں؟ انا بھی بھی کل سے کچھ کھانی نہیں رہی ہیں۔ اور دیکھیں آپ کو بخار کتنا ہو رہا ہے اور کھانسی تو بار بار آ رہی ہے۔ پلیز آپ کچھ کھالیں تاکہ دوائی کھائی جاسکے ورنہ طبیعت مزید خراب ہو جائے گی۔“ اس سے آخر کار ان کی حالت نہ دیکھی گئی تو وہ ان کے قریب بیٹھ کر گھوکیر لہجے میں بولی۔

”اچھا ہے، طبیعت زیادہ خراب ہوگی تو اس زندگی کی قید سے آزاد ہو جاؤں گی۔“

”امی! اللہ نہ کرے۔ میری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔“ وہ تڑپ کر بولی۔

”کرتی رہتا میرے بعد اپنا من مایاں۔ تمہیں میری فکر کیا ہے؟ کہاں خیال ہے ماں کی حالت کا۔ کتنی خوش تھی میں کہ اپنی زندگی میں بیٹی کو وداع کروں گی۔ مگر بیٹی اتنی خود سر اور ضدی ہوگی جو صرف اپنی چلانا جانتی ہوگی اس کا تو مجھے احساس ہی نہ تھا۔ ہاں جاؤ کرو اپنی خوشی پوری۔ ماں کی خواہش اور فرض سے تمہیں کیا فرض۔“

”امی! وہ!“ وہ بری طرح رو دی ان کی بدگمانی پر۔ لیکن ان کا دل نہ پگھلا۔

”مجھے سمجھنے کی کوشش کریں امی! مجھے غلط مت سمجھیں۔“

”خاموش رہو۔ سمجھنے سمجھانے کا وقت گزر گیا۔ میں بھی پاگل.....“ اس بار کھانسی کا اتنا شدید دورہ پڑا تھا کہ انہیں سنبھالنا دشوار ہو گیا۔

”قاخرہ! دو گھنٹ پانی پی لو۔ حلق بالکل خشک ہو گیا ہے۔“ انابی اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر ان سے منت بھرے لہجے میں بولیں۔

”نہیں انابی! میں نے قسم کھائی ہے۔ جب تک یہ میرا کہنا نہ مانے گی میرے لئے ایک گھنٹ پانی پینا بھی حرام ہے۔“ وہ تکلیف سے بے حال اٹھ لہجے میں بولیں۔

”کیوں بچوں کی طرح ضد کر رہی ہو قاخرہ! بچی کے ساتھ بچی بن رہی ہو۔ ماں

سے قبل نہ معلوم کس نے یہ شوشا چھوڑا کہ پہلے یہ گھر دولہا کے نام کیا جائے پھر نکاح ہو گا۔

ان دونوں کے حواس گم ہو گئے تھے۔ انہیں یہ امید نہ تھی کہ بارات دہلیز پر لانے کے بعد وہ یہ مطالبہ کریں گے۔ صلاح و مشورے کے بعد وہ یہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ مکان وہ رافع فیاض کے نام کر دیں گی لیکن حضرتی نے دھمکی دے دی کہ اگر مکان اس کے یا رافع فیاض کے نام کیا گیا تو وہ نکاح کرنے سے انکار کر دے گی اور یہ بات جب رافع فیاض کے کانوں تک پہنچی تو وہ صاف مکر گیا کہ اس کی طرف سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا۔

نکاح کے بعد کھانے کا پروگرام تھا کیونکہ بارات میں کتنی کے لوگ شامل تھے۔ فاخرہ نے کھانے کا اہتمام کر لیا تھا۔ دواغ ہو کر وہ رافع فیاض کے فلیٹ میں آگئی۔ یہاں اس کا سواگت کرنے کے لئے کوئی نہیں تھا۔ حاجی صاحب کی بیوی اسے سچے ہوئے پیڑروم تک چھوڑ کر گئی تھیں۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا، کمرہ روایتی انداز میں پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ فرنیچر اور دوسرا سامان سب کا سب اس کے جھجڑ کا ہی تھا۔

باہر قدموں کی آواز ابھری تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ آج اس کی زندگی کی یہ اہم اور انوکھی رات تھی جس کا تصور ہی نہایت حسین و کیف آور ہوتا ہے۔ لیکن اس کے دل میں ایسی کوئی خواہش نہ ابھری تھی جس سے جذباتوں میں ہلچل مچتی۔ ہلچل بچنے کے لئے جذباتوں کی صداقت بڑی اہم حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں نہ کوئی خواہش تھی اور نہ ہی جذبات۔ ماں کی خاطر وہ اپنی خواہشات کا قتل کر کے رافع فیاض کے ساتھ آئی تھی۔ یہاں تک آتے آتے اس کی خواہش اور آرزوئیں جل کر خاک ہو چکی تھیں۔ جہاں پر خواہشیں مرجائیں، وہاں سمجھوتے زندہ رہ جاتے ہیں۔ رافع فیاض کے ساتھ وہ سمجھوتہ کرنے آئی تھی۔ ماں کو خوش رکھنے کی خاطر سب کچھ منظور تھا۔

کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا تھا۔ اس نے گھبرا کر دیکھا۔ ایک درمیانی عمر کی فیشن ایبل عورت کے ہمراہ دوسری بڑی عمر کی بڑھیا خطرناک تیور لئے اندر داخل ہو رہی

چارے کا کوئی نہیں ہے اس لئے تھوڑی عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ کاروبار بھی اپنا ذاتی ہے۔ اسکرپ کا خاصا بڑا کاروبار ہے۔ اس کی نیت کا ہمیں سے اندازہ لگا لو کہ جہیز کے نام پر کچھ لینے کو تیار نہیں بلکہ میں نے کہا بھی کہ میں جلد شادی نہیں کر سکتی اپنی بیٹی کی تو بڑی چاہت و اپنائیت سے یو۔ ماں جی! جہیز کے نام پر میں پھوٹی کوڑی لینے کا بھی روادار نہیں ہوں۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے آپ کی بیٹی کے نصیب کا ہی ہے۔ آپ تو صرف اس چاند کو میرے آنکھن میں اتار دیں۔ میری زندگی میں اجالا ہی اجالا نکھر جائے گا۔ نہ معلوم کب اس نے حضرتی کو دیکھا اور حاجی صاحب سے خواہش کر بیٹھا۔

وضیح دار اور باوقار ماں کے منہ سے نکلنے والے آخری جملے نے اس کو پشیمردہ کر ڈالا تھا۔ تجا و بے سہارا ہونے کے خیال نے شاید ان کی سوچوں کو بھجورج کیا تھا جو وہ اس انداز میں سوچتے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ رافع فیاض کو بہت جلدی تھی اور فاخرہ کو اس سے بھی زیادہ۔ سو مکتبی کا جھنجٹ ہی نہ رکھا گیا، سیدھے سبب و شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔

رافع فیاض کے انکار کے باوجود فاخرہ اور انابی حسب استطاعت اس کے لئے جہیز تیار کر رہی تھیں۔ وہ اس دوران خاموش تماشاخی بنی ہوئی تھی۔ آخر کار وہ دن بھی آ ہی گیا کہ اسے پیلے جوڑے میں کرن لگا دو پتہ اور جا کر مایوں کی رسم ادا کر دی گئی۔ چند ہمسائیوں کے علاوہ حاجی صاحب اور ان کی بیوی نے بھی شرکت کی تھی۔ حاجی صاحب اور ان کی بیوی اس وقت وی آئی بیز کی حیثیت کے حامل تھے۔

رافع فیاض کی جانب سے وہ اگر اس کے بزرگ بنے ہوئے تھے تو یہاں بھی حضرتی حیات کے بڑوں کا حق وہی ادا کر رہے تھے۔ دونوں جانب ان کی خوب آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ اپنی بساط سے بڑھ کر انہوں نے اس کے لئے جہیز بنایا تھا۔

زیورات میں طلائی چوڑیاں، ننگن اور خوبصورت کانوں کی بالیاں تھیں جو امی نے اس کے شوق کے پیش نظر ایک عرصے سے روپیہ جوڑ جوڑ کر جوئی تھیں اور شادی والے دن خود اپنے ہاتھوں سے اس کی سرمریں کلائیوں میں پہنا کر کتنی دیر اس کے ہاتھوں کو اپنے چہرے سے لگا کر روٹی رہی تھیں۔ بارات میں بہت مختصر لوگ آئے تھے۔ نکاح

تھیں۔ ان دونوں کے چہروں میں اتنی مشابہت تھی کہ بغیر جانے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ماں بیٹی ہیں۔ ان کے انداز اسے خطرناک ارادے ظاہر کر رہے تھے کہ وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ اسی پہ دو صحت مند مرد ایک بانس کی طرح لمبے سوکھے، گہری سانولی رنگت کے مرد کو گر بیان سے پکڑ کر وہاں لے آئے اور قاتلو سامان کی طرح فرش پر پٹخ دیا۔ آف وہاٹ پانچاے اور شیروانی میں ملبوس اس شخص کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ وہی رافع فیاض ہے۔ اس کا شوہر نامہ اور لیکن اس حالت میں؟

”کیوں بھیجی، تم نے ہمیں بالکل ہی احمق سمجھ لیا تھا؟“ وہ بڑھیا آگے بڑھ کر غصے سے فرش پر پڑے رافع سے مخاطب ہوئی۔

”ایک بیوی تو تم سے سنبھالی نہیں جاتی اور اب دوسری لے آئے ہو۔“ وہ عورت ہم صم کھڑی خضریٰ کو کھانچا جانے والی نگاہوں سے گھورتی ہوئی بولی۔

”جسٹیس کیا نظر آیا تھا اس لنگور جیسی شکل والے میں؟ ہاں شاید تم سوچ رہی ہو کی والدہ آدی ہے، اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر سب کچھ لوٹ کر لے جاؤ گی۔“ بڑھیا جو شکل سے ہی لڑاکا دکھائی دے رہی تھی اس کی جانب بڑھتے ہوئے غصے سے بولی۔

”اس کا حسن تو میں ابھی برباد کر کے چڑیل بنادوں گی۔ اس نے میرے حق پر ڈاکا ڈالنے کی جرأت کی ہے۔ میں اس کا خون پی جاؤں گی۔“ دوسری عورت زنجی ٹانگن کی طرح تل کھا رہی تھی۔ اس کے لہجے سے حد درجہ سفاکی و درندگی جھلک رہی تھی۔

”میر کرور خسانہ! پہلے اس مردود سے نمٹ لیں پھر اس چمور کڑی کو بھی زندہ دفن کر دیں گے۔“ وہ دونوں بچے کئے آدی خضریٰ کو گھورتے ہوئے گرج کر بولے۔ ان کی لاتیں بڑی بے دردی سے رافع فیاض کے جسم پر پڑ رہی تھیں اور اس کے منہ سے نکلنے والی کراہیوں سے کمرہ گونج اٹھا تھا۔ وہ بری طرح ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگ رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مارے جارہے تھے۔

”ہم ایک جتنے کے لئے شہر سے باہر کیا گئے تو نے ہماری بہن پر سوکن لاکر بٹھا دی۔“ ”تجھے ہم نے عزت والی زندگی دی اور تو نے یہ صلہ دیا ہے احسان فراموش۔“

رخسانہ کا بڑا بھائی تو غم و غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

”تجھے تو میں مٹی کا تیل ڈال کر جلا کر ماروں گی۔ تو میری جگہ کس طرح لے سکتی ہے کیا؟“ رخسانہ نے غصے سے بھڑکتے ہوئے اسے دونوں ہاتھوں سے نوچنا چاہا مگر خضریٰ اس کا ارادہ بھانپ کر دور ہٹ کر سخت لہجے میں بولی۔

”پہلے میری بات سنو، یہ شخص مجھوٹا ہے مکار ہے۔ اس نے خود کو لا وارث اور غیر شادی شدہ ظاہر کر کے شادی کی ہے۔ اگر پہلے معلوم ہو جاتی یہ حقیقت تو ایسا کچھ نہ ہوتا۔ مگر بے فکر رہو، میں تمہاری جگہ لینے آئی ہوں اور تمہارا حق چھیننے۔ رافع فیاض تمہارے تھے اور تمہارے ہی رہیں گے۔ میں تمہارے درمیان سے نکل رہی ہوں۔“ اس نے ٹھہرے ٹھہرے مضبوط لہجے میں کہا تو وہ چاروں لمبے بھر کو دم بخود رہ گئے۔

”شاید آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا، اس سے زیادہ میں آپ کو سمجھانے سے قاصر ہوں۔ مگر یہ فیصلہ اٹل ہے کہ میں اب اس شخص کے ساتھ کبھی نہیں رہ سکتی۔“

”اگر تو اتنی ہی بچی اور وعدے کی پابند ہے تو یہ سب زیور ہمیں اتار کر دے۔ اور میں، تجھے رافع سے طلاق لینی ہو گی اور تجھے کوئی سامان واپس نہیں ملے گا۔“ رخسانہ اس کے قریب آ کر شرطیہ انداز میں کہنے لگی۔ اس کی باتوں کی تائید ان تینوں نے بھی کی، جبکہ رافع فیاض ظالمانہ مارے سے بے ہوش پڑا تھا۔

”منظور ہے مجھے۔“ اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فوراً جواب دیا۔

”چل جا۔ طلاق تو تجھے ابھی مل جاتی لیکن یہ منحوس آدی اس حالت میں نہیں ہے۔“ کئی برسوں تجھے طلاق کے کاغذات مل جائیں گے۔“ رخسانہ نے زیورات سمیٹتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا اور فرش پر پڑے ہوش و خرد سے بیگانہ رافع فیاض پر نفرت انگیز نگاہیں ڈال کر خاموشی سے باہر نکل آئی۔

”ہم تو جیتے جی سرگئے حاجی صاحب! جب آپ کو اس کے بارے میں معلوم نہ تھا تو کیوں ضائع بنے تھے؟ کیوں اس کی باتوں میں آ کر آپ نے میری بھول سی بچی کے

نصیب پر سیاہی پھیلا دی؟ ہم نے آپ پر اعتبار کیا، اپنا بزرگ سمجھا، لیکن یہی تصور تھا ہمارا؟“ فاخرہ نے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے ان سے شکوہ کیا۔

”اس میں تمہاری بیٹی کے نصیب کا دوش ہے۔ ہمیں تصور وار کیوں ٹھہراتی ہو بی بی! میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی نہ پڑیں ان چکروں میں۔ آج کل لوگ ہیں نیا احسان فراموش اور مطلب پرست۔ کل ہم سے اچھا کوئی نہ تھا آج ہم میں کیڑے نظر آ رہے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ اچھا ہوا تو اللہ نے کیا اور برا ہوا تو بندے بدنام ہوتے ہیں۔ ارے ہمیں بخشو بی بی! آئندہ ہم سے کوئی تعلق رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جانو، تمہاری بیٹی جانے۔ ہم نے تو سب نیک نیتی سے کیا تھا۔ برائی تو تمہاری بیٹی کے نصیب میں لکھی تھی۔“ حاجی صاحب کی بیگم جو ہر معاملے میں پیش پیش تھیں، اب حقیقت حال عیاں ہونے پر کوئی اصرار اپنے سر لینے کو تیار نہ تھیں، لہذا انہیں ہی مورد الزام ٹھہرا کر بڑبڑاتی ہوئی حاجی صاحب کے ساتھ وہاں سے چلی گئیں۔

”کوئی نہیں ہے، میں خود دے دار ہوں اپنی بیٹی کی زندگی تباہ کرنے کی۔ اس نے تو کتنا انکار کیا، ہر دلیل سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر میری عقل پر ہی بھروسہ پڑ گئے تھے جو اس کی ایک نہ مانی۔“ فاخرہ خود کو کوستے ہوئے رونے لگیں۔

”امی! کب تک خود کو الزام دیتی رہیں گی۔ یہ میری سیاہ بختی ہے جو اس وقت سے میرا پیچھا کر رہی ہے جب میں نے اس دنیا میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔“ وہ ان کے قریب بیٹھ کر ان کے آنسو صاف کرنے لگی۔

”بہت ہمت والی ہے میری بیٹی۔ ایسا صدر کس خاموشی سے برداشت کر رہی ہے۔“ انہوں نے شفقت سے اسے لپٹا لیا۔

”آداب عرض ہے جی!“ آواز تھی کہ دھماکا۔ دونوں ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”تم! تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں قدم رکھنے کی؟“ فاخرہ اس تک پہنچ کر غصے سے بولیں۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اسی طرح ڈھٹائی سے مسکراتا ہوا ہوا۔

”تین ہفتے بعد آیا ہوں، اس لئے قصہ دکھا رہی ہیں ساسو جی! درست ہے آپ کا

قصہ۔ لیکن ان سالوں نے کچھ مرمت ہی اس بے جگری سے کی تھی کہ زخم بھرنے اور ٹوٹے ہاتھ کا پلسٹر کھلنے میں دو ہفتے لگ گئے۔ ایک ہفتہ رخسانہ کو یہ یقین دلانے میں لگ گیا کہ میں نے خضریٰ کو طلاق دے دی ہے۔ اب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یقین آتے ہی اس نے میری مگرانی بند کرادی اور میدان صاف دیکھ کر میں یہاں چلا آیا۔“

”اگر تم میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو یہاں آنے کی بجائے سمندر میں ڈوب مرتے۔“ خضریٰ اسے گھور کر بولی۔

”عجیب بیوی ہو، شوہر کا خوش خوشی استقبال کرنے کی بجائے کیسی بے سرو پا ہاتھیں کر رہی ہو۔ چلو تیار ہو جاؤ، میں تمہیں سمندر کی سیر کروا لاتا ہوں۔“ اس نے خار ہونے والی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے لاڈ بھرے لہجے میں کہا۔

”مجھے تم سے، تمہارے نام سے کچھ نہیں لینا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ دھکے دے کر نکال دوں گی۔ کلی کے بچے پاگل سمجھ کر تمہیں پتھر ماریں گے۔“

”ساسو جی! یہ تربیت کی ہے تم نے اپنی بیٹی کی؟“

”تم جیسے سے تو پھر بھی خاصی بہتر کی ہے۔“ وہ خاصی ترکی بہ ترکی بولی۔

”کیوں بحث کرتی ہو، میں تمہیں وہ سب کچھ دوں گا جس کا کبھی تصور بھی.....“

”شٹ اپ، نکل جاؤ، فوراً نکل جاؤ یہاں سے۔“ وہ زور سے چیخی تھی۔

زندگی ایک دم ہی بوجھل ہو گئی تھی۔ اس کے غم کو فاخرہ نے جی کا روگ بنالیا تھا۔ بیمار تو وہ ایک عرصے سے تھیں کہ غربت و بے چارگی دنیا کی بدترین بیماری ہے۔ بیٹی پر گزرنے والی قیامت نے انہیں موم کی طرح اندر ہی اندر پگھلانا شروع کر دیا تھا۔ رافع فیاض، خضریٰ سے دستبردار ہونے کو راضی نہ تھا۔ اکثر اوقات آن و دمکتا اور یہی مطالبہ کرتا کہ خضریٰ اس کی بیوی ہے اور وہ اسے ساتھ لے کر جائے گا۔ یہ بات خضریٰ کسی طور ماننے کو تیار نہ تھی۔ اس کا کہنا تھا وہ دل میں اس سے تعلق توڑ چکی ہے۔ اب وہ مانے یا نہ مانے مگر وہ اسے اپنا شوہر نہیں مانتی۔ اسی کشمکش کے دوران وہ ایک رات ایسی

طبیعت کو اچھی طرح جانتی تھی۔ جس عورت نے قاتلوں کی حالت میں کسی سے ایک روٹی مانگا، گوارا نہیں کیا وہ بھلا بیٹی کی شادی کے لئے اس شخص سے قرض لیتیں جو ان کا داماد بننے والا تھا؟

”فاخرہ ایسی نہیں تھی۔ وہ کبھی اتنی بڑی رقم بطور قرض نہیں لے سکتی تھی۔“ اس کے جانے کے بعد انابی خضرئی سے مخاطب ہوئیں۔

”مجھے معلوم ہے انابی اور وہ ذلیل کس وجہ سے ایسا کر رہا ہے، وہ بھی آپ جانتی ہیں۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم سچ کوچ ثابت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

”میری بھی آنکھیں ساتھ چھوڑنے لگی ہیں ورنہ سلائی کڑھائی کے روپوں سے دال روٹی مل ہی جاتی تھی۔ اب تم صبح سے نکلے شام کو آتی ہو۔ اتنی محنت کے باوجود اسکول والے چند سو روپے پکڑا دیتے ہیں جو نکلی اور گیس کے بل بھرنے کے بعد کتنی کے بچتے ہیں۔ پھر پورا مہینہ جس طرح گزرتا ہے، صرف اللہ ہی جانتا ہے۔“

”آپ فکر مت کیجئے انابی۔ میں نے ایک بڑی جگہ اپلائی کیا ہے۔ شاید وہاں ملازمت مل جائے۔ خامی پریشانیوں دور ہو جائیں گی۔ خامی بڑی کہنی ہے۔ آپ ایسا کریں اوپر کے پورشن کو کرائے پر دے دیں۔ میں سب سے پہلے اس خبیث شخص کے جموئے قرض سے آزاد ہونا چاہتی ہوں ورنہ ہم دو افراد کے لئے اتنی تنگ و دو کی ضرورت نہیں تھی۔“

”اللہ ہی ہمارا انتقام لے گا ظالم رافع فیاض سے۔ دھوکے سے شادی کی اور مٹھوس سارا جہیز بھی ہڑپ کر گیا۔ وہ تو مجھے ہی اوسان آگیا تھا، وداع کے وقت جو میں نے تمہاری چوڑیاں اور کٹکن فاخرہ سے یہ کہہ کر تمہاری کلائیوں سے اتروا لئے کہ ویسے پر پتا دیں گے۔ کالج کی چوڑیوں نے کلائیوں میں جگہ ہی کہاں چھوڑی تھی۔ اس طرح یہ سچا ٹھکس۔“

”میں نے یہ سوچ کر مبر کر لیا انابی اوہ ہماری جانوں کا صدقہ کیا۔ آپ بھی یہی سوچ لیں۔“ اس نے دھیمے سے مسکرا کر انہیں سمجھایا تو وہ ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئیں۔

سوئیں کہ پھر کبھی اس رات کی صبح نہیں ہوئی۔ انابی اور خضرئی کو چھوڑ کر وہ ہمیشہ کے لئے دنیا سے چلی گئیں۔!

وقت گزرتا رہا اور احساس دلانے لگا کہ اسے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے گھر سے باہر قدم رکھنا پڑے گا۔ بہت کوشش کے بعد ایک پرائیویٹ انگلش اسکول میں اسے جاب ملی تھی جہاں محنت بہت زیادہ اور سیکری برائے نام تھی۔ مشکل سے دال روٹی مل پاتی تھی۔ اس دوران رافع فیاض نے انہونی بات کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ شادی کے لئے اس سے فاخرہ نے ایک لاکھ ادھار لئے تھے جو ایک سال بعد واپس کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

”دھوکے باز انسان۔ یہ تمہاری کوئی نئی گھٹیا سازش ہے۔ شرم نہیں آتی میری مرحوم ماں پر جموئے اٹرام لگاتے ہوئے۔ کچھ تو اللہ کا خوف کرو۔ کیا تمہیں موت نہیں آئے گی؟ کیوں میری مظلوم ماں کی روح کو آزار پہنچا رہے ہو؟“ وہ غضب ناک انداز میں بولی تو وہ اطمینان سے بولا۔

”اگر تمہاری ماں نے تمہیں نہیں بتایا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

”ارے میاں! ہم کیسے یقین کر لیں۔ میرے سامنے خود فاخرہ نے سب کچھ اپنے پاس سے کیا۔ وہ مجھ سے کوئی بات چھپانے والی نہیں تھی۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ ضرور ذکر کرتی۔ ایک لاکھ کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔“ انابی بھی سخت لہجے میں اس کی بات کی نفی کرتی ہوئی بولیں۔

”بس.....“ وہ ہاتھ اٹھا کر حکم بھرے انداز میں گویا ہوا۔ ”مجھے میری رقم جلد از جلد مل جانی چاہئے۔ جتنی جلد میری رقم ادا کرو گی اتنی ہی جلد میں تمہیں آزادی کا پروانہ دے دوں گا۔ مگر ایک سال کے اندر اندر میری رقم مجھے نہ ملی تو یاد رکھنا کبھی طلاق نہیں دوں گا۔“

اسے معلوم تھا وہ دھمکی محض دھمکی نہیں ہے بلکہ اس کی سازش کا حصہ ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے اس نے گھٹیا ترین چال چلی تھی ورنہ وہ اپنی ماں کی خود دار اور غیور

”آؤ! ماضی کس طرح اس کے ذہن کی اسکرین پر روشن ہو گیا تھا۔ رات دھیرے دھیرے گزر کر صبح کے روشن اجالے میں ڈھل چکی تھی۔ ایک ہی زادے سے بیٹھے بیٹھے اس کی کمر اکڑ گئی تھی۔ آنکھیں جو ماضی و حال کے تکلیف دہ وقت کے احساس سے مسلسل برس رہی تھیں، بری طرح سرخ ہو کر سوچ گئی تھیں۔ اسی دم خودگی سی اس پر چھائی تھی۔“

”سائیکس! یہ تو دوستی والی بات نہ ہوئی نا۔ رات آئے اور اب جانے کی بات کر رہے ہو۔ کچھ دن رکو ابھی۔ کیوں ہماری عزت مٹی میں ملانا چاہتے ہو۔ وجاہت سومرو کی مہمان نوازی کے گمن تو دشمن بھی گاتے ہیں۔ پھر تو تم جگر چان ہو ہمارے۔ اس طرح نہیں جانے دیں گے۔“ سومرو نے اسے بڑے دلار سے روکنا چاہا۔

”یار! مجھے فخر ہے تمہاری دوستی پر۔ جانتا ہوں تمہاری محبت کو۔ لیکن اس وقت میں عجیب ٹیلنس کا شکار ہوں۔“ اس نے سرکزی کی پشت سے نکال دیا۔ اس کی روشن پیشانی پر سوہیں ٹخنوں کی صورت میں ابھرائی تھیں۔ سحر انگیز مغرور آنکھوں کی سرخی میں الجھنیں تیرنے لگی تھیں۔ ”سمجھ میں نہیں آتا، آگے بڑھوں یا کراچی واپس لوٹ جاؤں؟“

”ہوں.....“ وجاہت سومرو اس کے قریب بیٹھ کر اس کی جانب بغور دیکھنے لگا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

”اس بار تم بہت بد دلے بد لے نظر آ رہے ہو۔“

”وہم ہے تمہارا۔ بھلا مجھے کون بدل سکتا ہے؟“ وہ دھیمے سے مسکرایا۔

”وہ لڑکی جو تمہارے ساتھ آئی ہے اور تم پہلی دفعہ کسی لڑکی کو ساتھ لا کر کمرے میں تنہا سوئے ہو اور اس کی وجہ سے تم نے ڈیرے پر جانے سے انکار کر دیا تھا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ شانزل خان کسی کا پابند نہیں ہو سکتا اور وہ بھی خصوصاً کسی لڑکی کا۔“ ایک لمحے کو اپنا لہجہ اسے خود انہی اور کھوکھلا لگا تھا مگر فوراً ہی اس نے اندر ابھرتے اضطراب پر قابو پالیا تھا۔

”اس سے قبل تو تمہیں کبھی کسی معاملے میں سوچنے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ نہ کبھی معمولی سی ٹیلنس بھی کبھی تمہیں چھو کر گزری تھی، پھر اب کیا ہوا؟“ وجاہت سومرو گہری نگاہوں سے اس کے رنگ بدلنے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ حضری حیات کی حیثیت بھی انہی لڑکیوں جیسی ہے جو محض وقت گزاری کا سبب بنتی ہیں۔ بعد میں حرف غلط کی طرح ذہن سے جن کے نام اور چہرے مٹ جاتے ہیں۔“ اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

”کاش..... تمہاری آنکھیں بھی تمہارے لہجے کا ساتھ دیتیں تو میں یقین کر لیتا۔“

”وہ شادی شدہ لڑکی ہے، اس لئے کسی بھی خیال کو دل سے نکال دو۔ اس کی فضول ہٹ دھرمی، ضد اور اکڑنے اب تک مجھے ضد پر اکسایا ہوا ہے۔ جس وقت وہ اپنی اصلیت پر آئی، چند گھنٹوں کو رنگین بنا کر بھول جاؤں گا اسے۔“

”نہ معلوم کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے..... خیر کچھ نہیں۔ میں تمہیں ابھی نہیں جانے دوں گا۔“ وجاہت سومرو نے دانستہ اس کی طرف دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

شانزل نے اس کی ادھوری بات جاننے کی کوشش نہیں کی اور مزید یہاں ٹھہرنے سے معذرت کر لی۔ اپنی اس نئی بے چینی اور اضطرابی کیفیت کو وہ خود بھی نہ جان پایا تھا۔

”صاحب! بی بی صاحبہ دروازہ نہیں کھول رہی ہیں۔ صبح سے کئی بار کھٹکھٹا چکا ہوں۔“

”وہاٹ؟“ نور محمد کی اطلاع نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

”دھمیراؤ نہیں۔ اگر تم اجازت دو تو ملازم روشن دان سے اندر جا کر دروازہ کھول دے گا۔“ وجاہت سومرو نے کہا۔

پوری طاقت سے دروازہ دھڑ دھڑانے کے باوجود بھی اندر سے کوئی آواز بلند نہ ہوئی تو وجاہت سومرو نے اجازت طلب کی اور اس کا جواب پاتے ہی ایک ملازم چست کی طرف چلا گیا تاکہ وہاں سے روشن دان کے ذریعے کمرے میں داخل ہو سکے۔

”اوہ..... اتنی دیر..... وہ کب اندر داخل ہو گا؟“ وہ از حد متوجش تھا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کچھ نہیں ہوگا۔ روشن دان بہت اونچا ہے، اسے نیچے اترنے میں چند منٹ تو لگیں گے۔“

”تم نہیں جانتے، وہ نہایت اچھی لڑکی ہے۔ کہیں اس نے..... کہیں اس نے خودکشی نہ کر لی ہو۔“ وہ نہایت پریشانی سے بولا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ گھبراؤ نہیں۔“ وجاہت سومرو نے خلوص سے تسلی دی۔ اسی دم ملازم نے دروازہ کھول دیا تو وہ وحشت زدہ سا اندر بڑھا تھا۔

بیلڈ پر اسے بے سادہ پڑے دیکھ کر وحشت سے بچھا۔

”دیکھا..... دیکھا تم نے۔ ہو گئی نا وہی بات۔ خودکشی کر لی نا اس نے۔“

وہ متحوش سائیڈ کی طرف بڑھا۔ خضریٰ بیلڈ پر بے سادہ پڑی تھی۔ شانزل نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر اس کی نبض چیک کی جو بہت ست رفتاری سے تپ رہی تھی۔ اس کے اندر چلتی آندھیاں شدت اختیار کرنے لگیں۔

”کیا ہوا؟“ وجاہت سومرو کچھ فاصلے پر کھڑا اس کی اضطرابی حرکات کا بغور جائزہ لے رہا تھا، اس کے چہرے پر پھیلتی وحشت اور پریشانی کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”دیکھی..... دیکھی! یہ زندہ ہے لیکن حالت بہت سیریس ہے۔ ڈرائیور کو کہو گا رکھالے۔ میں اس کو ہاسپٹل لے کر جاؤں گا۔“

وجاہت سومرو بھی نگر مند ہو گیا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا وہ باہر آیا تھا اور ڈرائیور سے اپنی گاڑی باہر نکلائی تھی۔ پیچھے پیچھے شانزل چلا آیا تھا، بہت احتیاط سے دونوں بازوؤں میں بیہوش خضریٰ کو اٹھائے ہوئے۔ یہ گاؤں کسی اعلیٰ اور بہترین ہاسپٹل کی سہولت سے محروم تھا۔

درمیانے احاطے میں بنی تین کمروں اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل وہ واحد ڈسپنسری تھی جہاں مجبوراً انہیں خضریٰ کو لانا پڑا تھا۔ وجاہت سومرو کو وہاں دیکھ کر الجھ سی جج مچی تھی۔ خضریٰ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔

”یہ..... یہ لوگ کامیاب تو ہو جائیں گے؟؟ پچالیں گے اسے؟“ شانزل جو مسلسل ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا، وجاہت کے قریب آ کر بولا۔

”شاید۔ اچھی امید رکھو۔ امید پر دنیا قائم ہے۔“ اس نے تسلی دی۔
”ہوں..... کتنے افسوس کی بات ہے۔ اتنے وسیع علاقے کے مالک ہو کر، بے پناہ

دولت کے وارث ہونے کے باوجود تم یہاں ایک اچھا باپ مل سک نہیں بتوا سکے؟ کیا ہوتا ہوگا یہاں ہزاروں بسنے والوں کا جب وہ ایسی کسی سنگین صورتحال یا بیماری کا شکار ہو جاتے ہوں گے۔ یقیناً مر جاتے ہوں گے۔ ان کی استطاعت یہاں آکر ختم ہو جاتی ہو گی۔ کیونکہ نہ ان کے پاس تنہا ہی طرح ہوا کے دوش پر اڑنے والی کاڑیاں ہیں، نہ بے پناہ دولت کا تحفظ اور نہ ہی شہروں میں بہترین و اعلیٰ شخصیات سے تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ لغت ہے ایسی دولت پر جو عیش و عشرت اور ہوس پرستی پر تو بے حساب نچھاور کی جائے مگر غریبوں کو ان کے انسانی حقوق سے بھی محروم رکھا جائے۔“ شانزل خان کے تاسف زدہ لہجے میں ایسی کوئی بات تھی کہ چند لمحے وجاہت سومروں کا ہیں از حد شرمندگی و ندامت کے باعث اٹھانہ سکا۔ وہ شانزل خان کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ پڑھائی کے دور کا بہت سا وقت اس نے کینیڈا میں اس کے ساتھ گزارا تھا۔ شانزل خان کھلی کتاب کی مانند تھا۔ اپنی زندگی کی کتاب کے سفید سیاہ اور ارق وہ کسی سے مخفی رکھنے کا روادار نہ تھا۔ بے شک اس میں وہ ساری خامیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جو اس جیسے از حد مردانہ وجاہت کے ساتھ ساتھ دولت کو بے دریغ استعمال کرنے والے شخص میں موجود ہوتی ہیں اور یہ بھی حقیقت تھی کہ بہت سی لڑکیوں سے اس کی دوستی تمام حدود پار کر جاتی تھی جن میں مدنی صد خواہشات لڑکیوں کی ہوتی تھیں۔ ایک طرف اس کے کردار میں جھول تھا تو دوسری طرف غریبوں کی امداد وہ بہت فراخ دلی سے کرتا تھا۔ ظاہری وخفیہ دونوں طریقوں سے۔ کئی ٹرسٹ اور ادارے اس کے زیر سرپرستی چل رہے تھے جس کا اس نے کبھی چرچا نہیں کیا تھا۔

اس وقت اس کی تنگی بھری تاسف زدہ آواز وجاہت سومرو کو آئینہ دکھا گئی تھی۔

”سوری یار! میں تو خود کو اپنے بزرگوں سے بہت بہتر اور انصاف پسند سمجھتا تھا۔ لوگوں کو معمولی سی سہولیات دے کر مطمئن تھا کہ میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ لیکن نہیں، اندر سے میں بھی رواجی و ذریعہ نکلا۔ کم ظرف، بے احساس، مظلوم غریب لوگوں کو کھڑے کھڑے سمجھنے والا گناہ گار انسان۔“

”جسمیں معلوم ہے مجھے محض دعوے، باتیں اور وعدے کرنے والے لوگوں سے اس قدر چڑ ہے جتنی ہم کسی مردہ خور جانور سے کرتے ہیں۔ بہتر وہی لوگ ہوتے ہیں جو کہتے ہیں، وہ کرتے ہیں۔ وہ وعدوں اور بکواس میں وقت کا زیاں کرنے کی بجائے کچھ کر کے دکھاتے ہیں۔“

”او کے..... اگلی بار آؤ گے تو دیکھنا وجاہت سومرو بکواس کرنے والا بندہ ہے یا کر کے دکھانے والا۔“ اس کے لہجے میں نئے عزم و ولولے کا جوش تھا۔

اسی وقت اندر سے ادیز عمر ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر دوسروں کے ہمراہ باہر آئے۔ ”مبارک ہو سائیں! خطرہ ٹل گیا ہے۔ مرینڈا اب بالکل ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر نے وجاہت سومرو کے قریب آتے ہوئے پُر جوش لہجے میں کہا۔

”اوو، ٹھیکس گاڈ.....“ وہ بے اختیار اندر چلا آیا۔

خفزی آنکھیں بند کئے بیڈ پر لیٹی تھی۔ دائیں ہاتھ میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ نامعلوم دوائیوں کے زیر اثر سورہی تھی یا اسے دیکھ کر آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔

وہ بیڈ کے قریب کھڑا اسے ایک تک دیکھ گیا۔ اس کے زرد چہرے پر ستواں کھڑی ٹاک، سیاہ بھونرا جیسی پلکیں بہت نمایاں ہو رہی تھیں۔

”خفزی!..... خفزی!“ اس نے جھک کر دھیرے دھیرے پکارا مگر اس میں کوئی جنبش بھی نہ ہوئی تو وہ وہیں بیٹھ کر اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر گویا ہوا۔

”اب..... کیسی طبیعت.....“

”چھوڑو..... میرا ہاتھ چھوڑو۔“ جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی وہ آنکھیں کھول کر چیخی۔

شانزل خان نے فوراً ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اس کی لرزتی پلکیوں کی جنبش سے سمجھ گیا تھا کہ وہ جان کر آنکھیں بند کئے پڑی ہے۔ اسے حرکت میں لانے کے لئے اس نے ہاتھ پکڑا تھا جس کا نتیجہ سو فیصد درست نکلا تھا۔

”ناراض مت ہو، میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ طبیعت کیسی ہے؟ کیا کر لیا تھا؟“

”شکر کیجئے سائیں، کچھ زیادہ زہریلا نہیں تھا۔“ وجاہت سومرو کے ہمراہ اندر آتے

ایک اونٹنی ڈاکٹر کی دعوت میں نے قبول کر لی۔“ ڈاکٹر کے باہر جاتے ہی وجاہت سومرو بولا۔

”ایک عرصہ سنگ رہنے کے باوجود تم میری نیچر کوٹ کچھ پائے۔ اب سوائے حیرت و افسوس کے کیا کر سکتا ہوں۔“ شانزل نے سنجیدگی سے کہا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ شام کے سرسبز سائے دور افق کے کناروں پر پھیل رہے تھے۔ خطرہ کی طبیعت اب بہتر تھی مگر اس کی بیزاری و خاموشی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

”پلیز دینی! اب اصرار نہ کرنا۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا اگر ایک بار کوئی ارادہ کر لوں تو اس سے دستبردار ہونا میرے لئے قطعی ناممکن ہو جاتا ہے۔ اپنی یہ عادت مجھے بھی قطعی

نا پسند ہے لیکن اس قدر پختہ ہو چکی ہے کہ اسے چھوڑنا چاہتا ہوں مگر یہاں میں خود سے شکست کھا جاتا ہوں۔“ باہر حویلی جانے والے راستے پر وجاہت کو کار لے جانے کا اشارہ کرتے دیکھ کر شانزل نرمی سے بولا۔

”اچھا۔ تم کبھی نہیں سدھرو گے۔ ہمیشہ اپنی ضد پوری کرتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ لیکن جانے سے قبل وعدہ کر کے جاؤ، بہت جلد ملنے آؤ گے۔“

”کیوں، تمہارے لئے کیا وہاں لو انٹری کا بورڈ آویزاں ہے؟“

”نہیں بابا! ایسا کیوں ہوگا۔ بس زمینوں کے جھگڑے ہیں جنہیں مناتے مناتے بھی کچھ عرصہ باہر نہیں نکل سکتا۔ آؤں گا، کچھ ٹروں سے غصے ہی آؤں گا۔ ایک احسان کرو،

اپنا ڈرائیور ایک ہفتے کے لئے مجھے دے دو۔ بڑے کام ہیں مجھے۔ میرے دونوں ہی ڈرائیور بیمار پڑے ہیں۔“ وجاہت سومرو نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”یہ کوئی احسان کی بات نہیں ہے۔ نور محمد حویلی میں ہی ہے۔ رکھ لینا اسے جب تک تمہارا کام نہیں ہو جاتا۔ میرے پاس بندے اور بھی ہیں۔“ شانزل خان نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ دونوں دوست گھلے ملے، کچھ رکی باتیں ہوئیں پھر وہ دونوں ایک دوسرے کو

الوداع کہتے اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔ وجاہت سومرو اس وقت تک ہاتھ میں پکڑا ہوا مال ہلاتا رہا جب تک ان کی کارنگ ہوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

ڈاکٹر کی گفتگو سن کر وہ چونک کر بولا۔

”کیا انہیں کچھ نے کاٹا تھا؟“

”جی ہاں۔ خوش نصیبی ہے نیگم صاحبہ کی کہ وہ کچھ معمولی سا زہریلا تھا ورنہ اس علاقے میں تو اتنے خطرناک سانپ کچھ موجود ہیں کہ ان کا کاٹنا پانی نہیں مانگتا۔ لمحوں

میں آدمی جان دے دیتا ہے۔“ ڈاکٹر، ڈیرے اور اس کے دوست کو یہاں دیکھ کر از حد مرعوب ہوا تھا کیونکہ وجاہت سومرو سے وہ واقف تھا اور شانزل کی شاندار وبا

رعب شخصیت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی طور پر وجاہت سومرو سے کم حیثیت کا مالک نہیں ہے۔ ان کے لئے اس نے اپنی طرف سے ڈپنسری کے پیچھے بنے اپنے

گھر میں پُر تکلف چائے کا اہتمام کر ڈالا تھا اور اب بہت اصرار سے انہیں دعوت دے رہا تھا۔

”نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ کی بے حد مہربانی ہے کہ آپ نے ہماری مہمان کی جان بچائی۔ چائے وغیرہ کا تکلف چھوڑیں۔ ہم حویلی جا کر چائے پیئیں گے۔“ وجاہت سومرو نے کہا۔

”مہربانی تو اللہ کی ہے سائیں۔ اس نے آپ کے ساتھ میری بھی لاج رکھ لی۔ آپ اپنے مہمانوں کو لے کر غریب خانے پر چائے پی لیں گے تو عزت افزائی ہوگی مجھے حقیر

بندے کی۔“ ڈاکٹر پُر خلوص اور مہمان نواز تھا۔ اس کے لہجے سے کوئی غرض و خوشامد نہیں جھلک رہی تھی۔ وجاہت سومرو کے دوبارہ انکار کرنے سے قبل وہ بول اٹھا۔

”ان کی ڈرپ ختم ہو جائے ڈاکٹر صاحب تو ہم ضرور آئیں گے۔ یہ ہمارے لئے سعادت و مسرت کی بات ہے کہ آپ جیسے نیک اور انسانیت کی خدمت کرنے والے

عظیم انسان سے ملاقات کا شرف نصیب ہو رہا ہے۔“ شانزل کے ان تحسین آمیز الفاظ نے ڈاکٹر کے چہرے پر چراغ سے روشن کر دیئے تو وہ شکر یہ کہتا ہو وہاں سے چلا گیا۔

”مجھے غلامت سمجھتا۔ میں نے اسی لئے انکار کیا تھا کہ کہیں تم پرانہ مان جاؤ کہ

”اؤ کے۔ تو مجھ پر بھی کسی کی دھوئیں نہیں چل سکتی۔“ اُس نے کار روک دی۔

”یہ..... کیا مقصد ہے؟“ اُسے کار روکتے دیکھ کر وہ بوکھلا گئی۔

”کار جب چلے گی جب آپ فرنٹ سیٹ پر بیٹھیں گی ورنہ میرے لئے کوئی مشکل

نہیں ہے اس طرح بیٹھے بیٹھے نہیں رات گزار دیتا۔“

”خواہ مخواہ کی ضد کر رہے ہیں آپ۔“ خضرئی نے شدید غصے سے کہا تھا۔ شانزل

نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور یونٹ پر بیٹھ کر باہر اچھلا پڑا وہی

سے دیکھنے لگا۔

شام کا گلابی آئین ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ رخصت ہوتے سورج کی ستہری کرنیں اپنے

روپ کا سونا خوب لٹا رہی تھیں۔ شہر کی آلودگی سے پاک فضا میں محسوس کی جانے والی

تازگی و لطافت تھی۔ ارد گرد کھیت پھیلے ہوئے تھے جن میں چھوٹے چھوٹے پیلے بھول

کھلے ہوئے تھے۔

گھاؤں کے کچے گھروں سے اٹھتی تازہ کھٹی مٹی کی روٹی اور ساگ کی خوشبو ہواؤں

میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ خوشبو نہیں اتنی اشتہا انگیز تھیں کہ اسے محسوس ہوا کہ بڑی شدت

سے بھوک لگ رہی ہے۔ رات بھی اس نے برائے نام کھایا تھا اور اب صبح سے کچھ بھی

نہیں کھایا تھا۔ چائے پر شانزل کے علاوہ ڈاکٹر، اس کی وائف اور وہاں سہیل سونو نے از

حد اصرار کیا تھا لیکن اس کی سرد مہری و خاموشی کے آگے وہ خاموش ہو گئے تھے اور اسے

ان کی رتی بھر پرواہ نہیں تھی۔

آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا ان دونوں کو اپنی اپنی فضول مندوں میں مقید ہوئے۔

”آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“ وقت تیزی سے گزرتا دیکھ کر بالآخر اُسے کہنا پڑا۔

”صرف کچھ وقت۔ حسین لکھن کی قربت کا تمنائی ہوں۔“ اُس نے جھک کر ذمہ داری

لجے میں کہا۔ اُس کی سرخ سرخ سحر انگیز نگاہوں میں وہی وحشیانہ چمک ابھر آئی تھی جس

کے پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر پڑتے ہی لاشعور میں کوئی انجانا سا خوف کندلی مار کر

چیتھ گیا تھا جواب اس کے لئے امتحان بن کر سر پر سوار ہو چکا تھا۔

شام کی جانب بڑھتے سائوں میں گاؤں کے مناظر و کش، سرسبز و شاداب سبزی کی

ماند لگ رہے تھے۔ وہ سستی خواہش مند تھی ایسے حسین اور قدرت سے قریب تر کر دینے

والے نگارے دیکھنے کی۔ اب خواہش مکمل ہوئی بھی تو بد مزہ تھی۔

خواہشات کا وجود بھی عجیب ہے۔ ذہن میں اس طرح آگ آتی ہیں جیسے خود رو

پودے بے طلب ہی زندگی پالیتے ہیں لیکن ان کی جڑیں خواہشوں کے پودوں کے

مقابلے میں بہت طاقتور و مضبوط نہیں ہوتی ہیں۔ خود رو پودوں کو ایک ہی جھٹکے میں

جڑوں سمیت اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے اور ان خواہشوں کی جڑیں تو انسان کو آکاس

بیلوں کی مانند جکڑ لیتی ہیں۔ انسانی وجود ہی خواہشوں کی بنیاد ہے شاید، جیسی زیست کے

ہر لمحے میں خواہشیں نکڑی کے چالوں کی مانند ہم سے لپٹی نظر آتی ہیں۔ ایک پوری ہو

جانے تو دوسری، تیسری، چارویں سانس تک ساتھ رہتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

کہ بعض خواہشیں جو بڑی زور آور ہوتی ہیں، جن کے پورا ہونے کا ہم انتظار کرتے

ہیں، وہ اگر قسمت سے کبھی پوری ہو بھی جائیں تو اذیت ناک بن جاتی ہیں۔ جیسا اب

اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

”ایکسکیوز می۔“ وہ نہ جانے کب سے پکار رہا تھا۔ اب کار ڈرائیو کرتے کرتے لمحے

بھر کو اس کی جانب دیکھ کر بولا تو وہ ڈرائیو چوکی تھی۔ جواب تو اسے کچھ نہیں دیا، صرف

ایک نگاہ اس کی جانب دیکھ کر دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”آگے آجائیے۔ مجھ سے تھما بیٹھ کر ڈرائیو تک نہیں ہوتی۔“ بہت فراخ دلی سے اس

کی ناگواری نظر انداز کر کے وہ بیٹاش لجے میں گویا ہوا۔

”نہیں آپ کی کسی بھی فضول عادت کو جاننا نہیں چاہتی اور نہ ہی پورا کرنے کی پابند

ہوں۔ سمجھے؟“ وہ اس کی جانب دیکھے بغیر سخت لجے میں بولی۔

”میں آپ کا ڈرائیو نہیں مخترمہ اکم آن۔“ اس کا لہجہ حتی تھا۔

”مجھے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔“

”میرا مطلب ہے آگے آ کر بیٹھ جاؤ۔“ خضرئی کے چہرے کے بدلنے رنگ دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے بات بدلی تھی۔

اس کی ہٹ دھرمی خضرئی کو اپنی بے بسی و مجبوری کا مکمل احساس دلانے لگی۔ وہ خاموشی سے پچھلی سیٹ سے اٹھ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”بہت بہت شکریہ۔“ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے وہ شوشی سے بولا۔

وہ خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ خضرئی دروازے کے ساتھ چپک کر بیٹھی تھی، گویا اس نے پھونکے کی بھی کوشش کی تو وہ دروازہ کھول کر باہر کود جائے گی۔

وقت کی رفتار کار کی رفتار سے زیادہ تیز تھی۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ شام کی گلابی رنگت رات کی سیاہی میں بدل چکی تھی۔ دن کی روشنی میں لگا ہوں کو سرشار کر دینے والا ہز و اب تاریکی میں ڈوبا اتنا ہی خوفناک لگ رہا تھا کہ اس پر نگاہ ڈالنے کو بھی دل نہ چاہ رہا تھا۔

اس نے کلائی پر بندھی وایچ میں ٹائم دیکھا تو حیرانی سے گویا ہوئی۔

”کیا واقعی آٹھ بجے ہیں؟“

”ہوں۔“

”لیکن یہاں تو ایسا لگ رہا ہے جیسے آدھی رات گزر چکی ہو۔“

”یہ گھاؤں ہے۔ غیر ترقی یافتہ اور پسماندگی کا نشان۔ بجلی اور گیس جیسی ضروری سہولیات ابھی یہاں میسر نہ ہو سکی ہیں۔ شہروں کی چکا چوند میں تو اس وقت ڈھنگ سے رات بھی شروع نہیں ہوتی لیکن ایسے دیہاتوں کے لوگ کم از کم میرے خیال سے تو خوش نصیب ہیں کہ اس دور میں بہت صاف و شفاف آب و ہوا میں سانس لے رہے ہیں جو ہم لوگوں کے لئے صرف خواب بن گئی ہے۔ کتنا فطرت سے قریب ہیں یہ لوگ۔ سادہ زندگی، سادہ ماحول، نمود و نمائش سے پاک لوگ جو صبح سورج نکلنے سے پہلے جاگ جاتے ہیں اور سورج ڈوبنے کے بعد جن کی رات شروع ہو جاتی ہے۔ ہم سے بہتر ہیں یہ لوگ، وقت کی قدر کرنے والے، جو وقت کے پیچھے نہیں بلکہ وقت جن

کے پیچھے چلتا ہے۔“ شانزل کے لہجے میں یہاں کے لوگوں کے لئے ستائش تھی۔ جب وہ ایسی باتیں کرتا تھا تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک خراب شخص ہے کیونکہ بظاہر وہ بہت زبردست پرستانہی رکھتا تھا۔ نرم خو، خوش اخلاق، لوگوں سے ملنے وقت وہ امیری غریبی کا فرق بالکل مٹا دیا کرتا تھا۔ اپنی امارت کے حوالے سے اس میں رتی بھر بھی غرور و تکبر نہ تھا۔

”شانزل خان! کاش تم ایک بدکردار شخص نہ ہوتے تو معشر سمجھے جاتے۔“ اس کی باتوں سے مستحضر ہو کر اس نے دل میں سوچا۔

کاراچا تک ہی جھٹکے سے چلتے چلتے رک گئی۔

”اوہ..... پٹرول چپک کرنا تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔“

”کیا..... پٹرول ختم ہو گیا؟“

”ہاں۔“ شانزل کے لہجے میں پریشانی محسوس کر کے وہ خود بھی پریشان ہو گئی۔ ”اب کیا ہو گا؟ پٹرول کہاں سے ملے گا؟ میں نے تو یہاں کوئی پٹرول شاپ دیکھی نہیں۔ اور اندھیرا بھی اس قدر ہے۔“

”گھبراؤ نہیں۔ کوئی نہ کوئی بندوبست کرتا ہوں۔“ اُسے پریشان اور گھبرایا ہوا دیکھ کر اس نے نرم لہجے میں تسلی دی۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تمہارے اندر پچھلی شیطیت اور ہوس کی وجہ سے۔“ نامعلوم تم جیسے کم طرف و بے ضمیر لوگوں کو اوپر والا اتنا کیوں نواز دیتا ہے کہ تم لوگ آپے سے باہر ہو کر خود کو خدا سمجھنے لگتے ہو۔ اور خدائی کے دعوے کرنے والے شیطانوں کے عبرت ناک انجام سے باخبر ہونے کے باوجود نفس کے گھوڑے پر دوڑتے رہتے ہو۔ بدکار لوگ۔“ خضرئی کے لہجے میں وہی بے پناہ نفرت و حقارت سمٹ آئی تھی جو شانزل کی رنگ رنگ میں تذلیل و تحقیر کے افکار سے دو بکا دیا کرتی تھی۔

”خضرئی حیات! حد میں رہو اپنی۔“

”کیا تمہارے لئے کوئی حد تعین نہیں ہے؟“

”کیا، کیا ہے میں نے؟ کون سی حد پار کی ہے؟“ وہ زیادہ دیر اپنے درشت لہجے پر قابو نہ پاسکا۔

”اوجھ..... کیا، کیا ہے میں نے۔ تمہارے پاس منیر ہی کہاں ہے جو معلوم کر سکو کہ کیا، کیا ہے تم نے؟“ وہ غصے سے شانزل کے الفاظ دہرا کر بولی۔

”وہ اچھا۔ شاید تمہیں اپنا مہینہ یاد رہا ہے۔ تم اس سے اسی طرح لڑتی ہو گی۔ تب ہی...“

”شٹ اپ۔“

”نیو مائنڈ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں، بلکہ خوشی ہے کہ اسی حساب سے میرے لئے تھوڑی گنجائش اور کمال لو۔ یعنی لڑائی کے بعد پیار کا مرحلہ.....“

”تم..... تم..... آگے ایک لفظ بھی کہا تم نے تو میں تمہارا منہ توج لوں گی۔“

”اوکے..... اوکے، ریلیکس۔ یہ لڑائی اور پیار کے مرحلے تو ہم بعد میں طے کریں گے۔ پہلے یہ مسئلہ تو حل ہو کہ اب کیا کرنا ہے؟“ اس کی آنکھوں میں شوخی اور لبوں پر بھرپور مسکراہٹ تھی۔ گویا وہ اس کے غصے سے از حد انجوائے کر رہا ہو۔

خضریٰ نے کچھ نہیں کہا لیکن دل ہی دل میں اسے خوب کوسنوں سے نوازا رہی تھی۔ شانزل کا رے سے نکل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دونوں اطراف نہ معلوم کس چیز کے

کھیت تھے جن کی اونچائی کے باعث کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر صرف اور صرف گھوڑا اندھیرے کا احساس ہو رہا تھا کیونکہ ان کی کار درمیانی سڑک پر تھی جس کے دونوں

جانب ان کھیتوں کا سلسلہ بہت آگے تک چلا گیا تھا۔ وہ دانت بچھنے شانزل کو دیکھ رہی تھی جو نہایت اطمینان سے تھوڑا سا جائزہ لے کر

سینٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

”کیا رات اسی طرح گزرے گی؟“

”نہیں..... اگر تم چاہو تو بہت خوشگوار گزر سکتی ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر پھر مسی خیر مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔

”تم بھی حسرت دل میں لے کر مر جاؤ گے۔ تم مجھے تو کیا میری پرچائیں کو بھی نہیں پاسکتے۔ سمجھے؟“

”چینچ کر رہی ہو؟“ اس نے جھک کر اس کی نگاہوں میں جھانکا۔

”جو سمجھو۔“ اس کے جیسے ہوش دھاس معطل ہو گئے تھے۔

”جہیں گھنٹہ کس بات پر ہے؟ کیا سمجھتی ہو خود کو؟“ اس کے لہجے میں چنگاریاں

سنگ رہی تھیں۔ مزید اس کے کہ بات بڑھتی، لمحہ بھر میں اس نے اُبھرتے غصے پر قابو پا لیا۔ دوسرے لمحے وہ بہت پُر سکون اور مطمئن نظر آ رہا تھا، گویا ان کے درمیان کوئی بد مزگی

ہوئی ہی نہ ہو۔ یہی خصوصیت اس کے شاطر اور خطرناک ہونے کی دلیل تھی۔ دشمن وہی زیادہ خطرناک ہوتا ہے جو ٹھنڈا مزاج رکھتا ہو اور جذبات پر قابو رکھنا جانتا ہو۔ وہ اسی

فطرت کا مالک تھا۔

”ہر وقت غصے میں رہنا بری بات ہوتی ہے۔ فی الحال یہاں اندر ٹینسی رہنا، میں ذرا آگے جاتا ہوں، دیکھتا ہوں کیا صورتحال ہے۔ دوبارہ وہی بے وقوفی مت کرنا جو

وجاہت سومرو کے ہاں کر چکی ہو۔ وہاں ہر طرف رات میں اسپرے ہوتا ہے، اس کے باوجود تم بچھوکا بھکار ہو گئی تھیں۔ یہاں یقیناً سانپ، بچھوؤں کے علاوہ اور بھی زہریلے

کیڑے ہو سکتے ہیں۔“ اس نے ڈرائیونگ ڈور کھولنے سے قبل اسے سمجھا دیا تھا۔

وہ چلا گیا تو خضریٰ نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔

شانزل تیزی سے آگے کی سمت جا رہا تھا۔ بے اختیار وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہ دائیں جانب مڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے ارد گرد دیکھا اور کھیتوں میں پھیلی تاریکی نے اسے خوفزدہ کر دیا۔ وہ کیسا بھی تھا لیکن اس کی موجودگی میں تباہی کا خوف نہیں تھا۔ اس نے تیزی سے کھڑکی کے شیشے

چڑھائے اور نگاہیں جھکا کر بیٹھ گئی اس ارادے سے کہ اب باہر نہیں دیکھے گی۔ مگر سوج کے برخلاف بے ساختہ اس کی نگاہیں باہر اٹھ رہی تھیں۔

ہواؤں کے زور سے کھیتوں میں ہونے والی سرسراہٹیں بھی اسے بڑی پراسرار لگ

رہی تھیں اور دل سوکھے سچے کی مانند کانپ اٹھتا تھا۔

کچھ دیر بعد شانزل ایک شخص کے ہمراہ آتا ہوا نظر آیا تو اس کی جان میں جان آئی۔
 ”آ جاؤ باہر۔ شکر کرو یہ نیک فرشتہ اتفاقاً پڑھائی کرتا ہوا مل گیا۔ ورنہ یہاں کے
 لوگ تو لگتا ہے سورج کے ساتھ ہی نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔“ شانزل فریٹ
 ڈور کھول کر اس سے مخاطب ہوا تو وہ بھی کانپتی ہوئی باہر نکل آئی۔ شانزل کارلاک
 کرنے لگا۔ خضریٰ نے اچھتی ہوئی نگاہ دوسرے شخص پر ڈالی۔ وہ سترہ اٹھارہ سالہ
 نوجوان تھا جس کے چہرے پر معصومیت اور بھجک تھی۔ وہ نگاہیں جھکائے سوہب سا
 کھڑا تھا۔

”چلو۔“ وہ کارلاک کر کے آیا تو بولا۔ کار کی ہیڈ لائٹس بند ہو جانے کی وجہ سے
 وہاں یکدم اندھیرا چھا گیا تھا۔ صرف نیلے آکاش پر چمکتے چاند کی شینل چاندنی تھی جو
 وہاں بکھری ہوئی تھی جس سے عجیب طلسماتی سحر انگیز ماحول دور ہا تھا۔
 ”ہاتھ تمام لو میرا۔ راستہ خراب ہے، کہیں گرنہ جاؤ۔“ خضریٰ کو کئی دفعہ ٹھوکریں
 کھاتے دیکھ کر اس نے ہمدردی سے کہا۔

”بے فکر رہو۔ کم از کم آپ کے سامنے تو میں ہرگز نہیں گر سکتی۔“
 ”اوکے، جیسی تمہاری مرضی۔“ وہ شانے اچکا کر لا پرواہی سے گویا ہوا اور اس
 نوجوان کے ساتھ باتیں کرتا چلنے لگا۔

لیکھت کھیتوں میں سرسراہٹ ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا تو خوف و دہشت سے
 آنکھیں پھٹ گئیں۔ دو لمبے بازو قد میں دائیں بائیں پھیلائے ایک بے تحاشا لمبا وجود
 کسی دوسری مخلوق کا تھا جس کے چہرے کے خدو خال اتنے ہی بھیا تک تھے کہ اس کی
 بے ساختہ چیخ نکل کر خاموشیوں میں ارتعاش پیدا کر گئی۔

”کیا ہوا..... کیا ہو؟“ وہ دونوں جو اس سے چند قدم کے فاصلے پر چل رہے تھے،
 چیخ سن کر برق رفتاری سے اس کی طرف آکر پوچھنے لگے۔
 ”وو..... وو.....“ مارے دہشت کے اس کے لبوں سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

”کون ہے؟ کس سے خوفزدہ ہو گئیں؟“ شانزل اس کے کانپتے وجود کو دیکھ کر نرمی
 سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوا۔

”وو..... وہ کیا ہے؟“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس عجیب و غریب مخلوق کی
 طرف اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ کے اشارے پر دونوں نے دیکھا۔

”وو..... وہ تو جی اشیو ہے۔ دراصل فصل تیار ہو جاتی ہے تو پرندے خراب کر دیتے
 ہیں۔ پرندوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے ایسے اشیو بنائے جاتے ہیں۔ پرندے انہیں
 انسان سمجھتے ہیں اور فصل سے دور رہتے ہیں۔“ اس نوجوان نے سادگی سے معلومات
 فراہم کیں تو وہ اپنی بیوقوفی پر از حد شرمسار ہو گئی۔ شانزل قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

”واوا کیا خوب بنایا ہے بنانے والے نے۔ جب اس بانس کے بنے ہوئے
 انسان کو دیکھ کر انسان ہی ڈر رہا ہے تو پیارے پرندے تو دور سے ہی بھاگ جاتے
 ہوں گے۔“ اس نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بلکہ اسے مسکراتے ہوئے وہ دیکھ
 چکی تھی۔

ایک چھوٹے کمرے اور وسیع کھلے محن والے گھر میں لائٹیں کی زرد روشنی پھیلی
 ہوئی تھی۔ اس لڑکے نے جس کا نام منور تھا اور اس کی ماں نے ان دونوں کا بہت گرم
 جوشی سے استقبال کیا تھا۔ پرائے، آم کا اچار اور جھنے تیلے سے ان کی خاطر مدارات
 کی تھی۔

اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا تھا۔ بھوک کتنی خالم چیز ہوتی ہے۔ اسے پہلی دفعہ
 احساس ہوا تھا کہ کس طرح بھوک سے مجبور ہو کر لوگ کوزے سے اٹھا کر روٹی کھا لیتے
 ہیں۔ پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر ہی تو لوگ نہ جانے کیسی کیسی آگ میں جلتے ہیں۔

”معاف کرنا صاحب، ہم غریب لوگ ہیں۔ آپ لوگوں کی خدمت و خدمت سے نہ
 کر سکیں گے۔ جو اللہ نے دیا ہے سب آپ کے لئے حاضر ہے۔“ کھانے سے فارغ
 ہوئے تو منور کی ماں ان سے عاجزانہ لہجہ میں بولی۔

”آپ ہمیں شرمندہ کر رہی ہیں ماں جی۔ یہ تو آپ کا خلوص اور مہربانی ہے کہ آپ

جاری تھی۔ نیم تاریکی اور چاند کی روشنی میں اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی قدیم دور میں داخل ہو گئی ہو۔

سیاہ آسمان پر چاند اور ستارے اتنے روشن و شفاف تھے کہ ان کی روشنی و طلسماتی حسن سے نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ اُس نے اپنی زندگی میں پہلی بار اتنا خوبصورت آسمان دیکھا تھا۔ شہروں میں فضائی آلودگی نے ایسے حسین نظارے ہم سے چھین لئے ہیں، ایئر کنڈیشن روڑز میں بھی وہ سکون و راحت محسوس نہیں ہوتی جو اس وقت اس کچی اینٹوں سے بنے معمولی سے گھر کے صحن میں محسوس ہو رہی تھی۔

ابتدا روشن، نگاہوں کو شندک پہنچاتا چاند، اس کے اطراف پھیلے تاجدار نگہ ستاروں کی چمک ہیروں کو بھی مات دے رہی تھی۔ اس لمحے وہ سب بھول کر ماحول کے حسن میں کھو گئی تھی۔ ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ چاندنی کا غبار عجب فسون خیز تھا۔

”ستاروں کی کتنی رہنے دو۔ آج تک کوئی اتنا جینفس پیدا نہیں ہوا جو انہیں اچھی طرح گن سکے۔ رات گہری ہو رہی ہے، پلیز سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔“ معا تاریکی میں شانزل کی نیند سے بوجھل آواز ابھری۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔ وہ تو اُسے سوتا ہوا سمجھ رہی تھی مگر وہ آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔

”مجھے ابھی جگہوں پر نیند نہیں آتی۔“

”وہم ہے تمہارا۔ نیند تو وہ ظالم شے ہے جو سولی پر بھی آ جاتی ہے، پھر یہاں تو ماحول ہی بہت سحر انگیز ہے۔“ اس کی بھاری آواز گونجی۔

”آپ سو جائیں مجھے جب نیند آئے گی، سو جاؤں گی۔“

”شاید مجھ سے خوفزدہ ہو۔ فی الحال ایسے کسی خوف کو دل میں جگہ نہ دو۔ شاباش ہو جاؤ۔ ابھی آگے لیا سفر کرنا ہے۔ نیند پوری نہ ہوئی تو طبیعت پر کس قدری چھائی رہے گی۔“ اس وقت اُس کا لہجہ بہت پر غلوص اور مکاری سے پاک تھا۔

”آپ مجھے گھر چھوڑ دیں۔ میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ اسے انسانیت کے لبادے میں دیکھ کر خطر کی ممنونیت سے بولی کہ جان بچی تھی وہ اکثر اور

نے وہ انہیوں کو اپنے گھر میں ٹھہرنے کی اجازت دی، ہماری خاطر داری کی، ورنہ اس دور میں کہاں ایسی سروت و اپنائیت زندہ رہی ہے۔ لوگ اپنوں سے کتراتے ہیں، بھلا انہیوں کے لئے کہاں گنجائش ہوتی ہے۔ گھر میں نہ دل میں، باہر سے ہی فارغ کر دیا جاتا ہے۔“ شانزل کے لہجے میں حقیقی غلوص تھا۔

”مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ منور نے مجھے جب بتایا کہ شہر سے گاڑی آ کر یہاں رُک گئی ہے تیل ختم ہونے کی وجہ سے تو میں نے جیسی اس سے کہہ دیا تھا کہ جا کر مہمانوں کو لے آئے۔ کیونکہ یہاں کوئی ہوٹل نہیں ہے اور گھر بھی بہت کم ہیں۔“

”چلے صاحب! بستر لگا دیئے ہیں۔“ منور نے آ کر اطلاع دی تو وہ اٹھ گئے۔ صحن کے درمیان میں چار پانگ بچے ہوئے تھے۔ پہلے پر منور لیٹ گیا تھا، دوسرے پر اس کی ماں، تیسرا چنگ خالی تھا، چوتھے پر شانزل دراز تھا۔ چاروں چنگ ترتیب سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بچے ہوئے تھے لیکن تھے ایک ہی لائن میں۔

”کب تک سوچتی رہو گی؟ لیٹ جاؤ آ کر۔“ اُسے بت بنے دیکھ کر شانزل کو کہنا پڑا۔

”یہ کون سا طریقہ ہے سونے کا؟“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”بہت باوقار و شریفانہ طریقہ ہے۔“

”میں اس طرح نہیں سو سکتی۔“

”پلیز ہر وقت صرف اپنے متعلق نہیں سوچتی رہا کرو۔ تمہاری ”میں“ سے بہت چڑ ہے مجھے۔ کم آن، مت تنگ کر دانا سیدھے سادھے مہمان نواز لوگوں کو، ان کی تحن کی احساس نہیں ہے تمہیں۔ دیکھو لیتے ہی بے خبر ہو گئے ہیں۔“

منور کی ماں کے خزانے صحن میں گونجنے لگے تھے۔ وہ خاموشی سے آ کر سر سے پاؤں تک تھیں لپیٹ کر لیٹ گئی۔ شانزل پہلے ہی اپنے چنگ پر دراز تھا۔

دھیرے دھیرے چلتی ہواؤں کے جھونکوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔ سامنے کمرے کے دروازے کے پاس گلی موٹی سی کیل پر لائین لگی ہوئی تھی جس کی روشنی ہم بدم و جیسی پڑتی

”اس طرح الگ تھلک، خاموش رہو گی تو طبیعت بیلنے کی بجائے مزید خراب ہو گی۔ دیکھو بی بی! عمر میں، میں آپ سے بہت بڑی ہوں اور حیثیت تو خاک کے ذرے کے برابر بھی نہیں ہے، لیکن برائیاں مالو تو کچھ باتیں بھلائی کی ضرورت ہوں گی۔ اس دور میں کوئی بھی مرد اتنا بلند حوصلہ و ہمت نہیں رکھتا جتنا میں شانزل صاحب میں دیکھ رہی ہوں۔ عورت تو مرد کے تیور و مزاج دیکھ کر چلتی ہے، پھر بھی اتنی عزت نہیں پاتی۔ بہت اچھی قسمت والی ہو آپ بی بی! جو ایسا خیال رکھنے والا، چاہنے والا گھر والا ملا ہے۔“

”گھر والا؟“ اس نے حیرانی سے ان کے لفظوں پر غور کیا۔

”میں بھی دیکھ رہی ہوں، کل سے آپ نے ابھی تک ان سے کوئی بات نہیں کی ہے۔ دور دور، اکھڑی اکھڑی سی لگ رہی ہیں۔ ایسا نہیں کرتے۔ مرد تو سر کا سائیں ہوتا ہے۔ مضبوط پناہ گاہ ہوتا ہے اور ان جیسا چاہنے والا تو.....“

”کس نے کہا؟ کس نے کہا وہ میرا کچھ لگتا ہے؟“ وہ ایک دم ہی اس کی بات قلیح کر کے کھڑی ہو گئی۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی نے کھولتے تیل میں پانی ڈال دیا ہو۔ غصے اور جنون سے چہرہ سرخ و جسم لرزے لگا تھا۔

”نہ..... ناراض نہ ہو بی بی! مجھے صاحب نے ہی بتایا ہے۔“ منور کی ماں بری طرح سہم گئی۔

”وہ..... وہ ذلیل کینہ انسان میرا کچھ نہیں لگتا۔ آوارہ، بد معاش، مجھے میری مرضی کے بغیر اغوا کر کے لایا ہے۔ میرا کوئی رشتہ نہیں اس سے۔“ ابھی تا معلوم کیا وہ اسے کہتی کہ لے بھر میں وہ اندر داخل ہو کر اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بڑے افسردہ لہجے میں ان سے مخاطب ہوا۔

”میں نے کہا تھا نا آپ سے ماں جی، انہیں دماغی دورے بھی پڑتے ہیں اور اس دوران میں یہ ایسی ہی باتیں کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ مجھے گالیاں بکنے سے بھی نہیں چھوکتیں۔“ خضر کی کوشش کے باوجود بھی اس کے ہاتھ کی سخت گرفت سے اپنے ہونٹوں کو آزاد نہ

دخول سے کبھی کوئی بات نہیں ماننے کا چاہے اس میں اپنا کتنا ہی نقصان کر بیٹھے۔ سو اسے راہ راست پر لانے کی خاطر اس نے اپنے رویے میں تبدیلی ناگزیر سمجھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ مگر یاد رکھنا، احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے۔“

گھوڑوں کی صبح بہت خوب صورت تھی۔

قرائی انڈوں اور دیکسی گھی سے تر پڑھوں سے ناشتہ کیا گیا۔ شانزل ان ماں بیٹے سے بہت کھل مل گیا تھا۔ حالات اس کے موافق ہوتے تو وہ بھی ان کے خلوص و مروت کا اظہار زور و شور سے کرتی۔ اس وقت تو صرف دل ہی دل میں معترف تھی۔

ناشتے کے بعد منور کی ماں نے دو بار انہیں چائے بنا کر دی تھی۔ چائے عمدہ تھی۔ شانزل کی تعریف کے جواب میں بولی۔

”منور شہر پڑھنے گیا تو یہ لت لگا کر لایا۔ اب تو میں بھی چائے کی عادی ہو گئی ہوں۔ ان دنوں چھینوں میں منور گھر آیا ہوا ہے۔“

اس کی سنجیدگی اور خاموشی کو منور نے بوریٹ سے تعبیر کیا تھا، سو اسے بھلانے کے لئے بہت سے رسالے لاکر دیئے تھے۔ وہ ان سے کچھ دور بیٹھی رسالے دیکھ رہی تھی۔ بلا ارادہ اس کی نگاہ سامنے انہی تو منور کی ماں بڑی ترس کھائی، ہمدردانہ نظروں سے اس کی جانب گاہے بگاہے دیکھ رہی تھی اور شانزل خان ان سے باتیں کرتے ہوئے بہت فکر مند ورنجیدہ لگ رہا تھا۔ نہ معلوم اسے اس کا یہ انداز از حد معنی خیز و پراسرار کیوں لگ رہا تھا۔

”آپ شہر سے آئی ہو، یہاں دل تو نہیں لگ رہا ہو گا۔“ شانزل منور کے ساتھ باہر نکلا تو وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

”نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ گھوڑوں شہر کے مقابلے میں بہت پُر سکون جگہ ہے۔“ رسالے ایک طرف رکھ کر وہ قصداً مسکرا کر گویا ہوئی۔

”پھر اتنی خاموش اور پریشان کیوں لگ رہی ہو؟“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

پٹرول لے آیا۔

پھر واپسی کے سفر تک حضریٰ کا سوڈا درست نہیں ہوا تھا۔ منور کی ماں نے بہت دُعاؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا تھا۔ دونوں ماں بیٹے کا کافی دور تک چھوڑنے بھی آئے تھے۔

کار کا سفر ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ حضریٰ بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ شانزل نے کئی بار دُعا دیکھی تھی کہ اس کی جانب دیکھا بھی لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ گویا بالکل بیگانہ والا تعلق بنی ہوئی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ موسم ابر آلود ہونے کے باعث نضاؤں میں خنکی و خوشگواریت تھی۔ سڑک کے دونوں طرف پھیلا چاول کے کھیتوں کا سلسلہ دلکش لگ رہا تھا۔

”تاراض ہو؟ مجھے اپنے سے زیادہ تمہارا اور تمہاری عزت و وقار کا خیال تھا ورنہ مجھے ضرورت نہیں تھی یہ جھوٹ بولنے کی۔“ اُس نے گویا اُسے بولنے پر اُکسایا۔

”کہاں جا رہے ہیں اب آپ؟“ وہ اُس کی متائی نظر انداز کر کے پوچھنے لگی۔

”گھر، یعنی کراچی۔“

”سچ؟ آپ جھوٹ تو نہیں بول رہے نا؟“

”نہیں۔ آپ نے کہا تھا، احسان کروں۔ پہلے میں آپ پر احسان کروں گا، آپ کو کراچی واپس لے جا کر۔ پھر آپ احسان کریں گی مجھ پر، کچھ وقت میرے ساتھ گزار کر۔ احسان کا بدلہ احسان ہے اور بدلہ جتنا جلد اتنا دیا جائے یہی بہترین عمل ہے۔“ شرافت سے بات کرتا کرنا وہ بالآخر اپنی کمینی خصلت پر آ گیا تھا۔

”اس احسان کا بدلہ ایسا اتادوں گی کہ آپ تاحیات یاد رکھیں گے کہ کس سے واسطہ پڑا تھا آپ کا۔“ وہ دانت بھیج کر معنی خیر لہجے میں کہہ اُٹھی۔

”اوہ..... گڈ! تو آپ مجھے کہنی دینے پر راضی ہو گئیں؟“ وہ مسرت سے جھوم اُٹھا۔

”ہاں۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔“ وہ جبراً مسکرائی۔

”جھینکس..... جھینکس مائی سویٹ ہارٹ! میں بہت خوش ہوں۔ اتنا خوش کہ میری

کر پائی۔ مستزاد شانزل کا اداکاری سے بھرپور لہجہ اور ماں جی کی رحم زدہ نگاہیں۔ اس لمحے سچ سچ اس کا دل شانزل کو قتل کرنے کو چمکنے لگا۔

”دُعا کروں گی، واللہ آپ کی اس مصیبت کو اپنے کرم سے دور کرے۔ آو..... ہا! بھلا کوئی کہہ سکتا ہے اس قدر بیماری لڑکی ایسے سوڈی مرض میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ یہ سب اوپر والے کے کھیل ہیں۔ خیر وہی مشکل آسان کرے گا۔“

”اگر ایک گلاس شند پانی مل جائے تو.....“

”میں لاتی ہوں ابھی۔“ منور کی ماں پھرتی سے دروازے سے باہر نکل گئی تو شانزل نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹالیا اور اس کے بچھے امداد کو نظر انداز کر کے بولا۔

”کچھ کہنے سے پہلے عقل بھی ذرا استعمال کر لیا کرو۔“

”آپ کو جرأت کیسے ہوئی یہ سب بکواس کرنے کی؟“ وہ بالکل آؤٹ آف کنٹرول تھی اس وقت۔

”مصلحت کے تحت کبھی ایسی بکواس کرنی پڑ جاتی ہے مائی ڈیئر! یہ گاؤں کے سیدھے سادھے لوگ ماں باپ، بہن بھائی یا میاں بیوی کے علاوہ کسی چوتھے رشتے کو فاشی و بدکاری کے زمرے میں دیکھتے ہیں اور ایسے لوگوں کی پرچھائیوں سے بھی کراہت محسوس کرتے ہیں۔ ایسے میں، میں نے دانش مندی سے سوچ سمجھ کر جھوٹ بولا تھا کہ اس طرح ان کی نگاہوں میں ہم دونوں کی عزت برقرار رہے۔ اگر میں تمہارے مزاج کو جانتے ہوئے یہ نہ کہتا کہ تم دماغی مریضہ ہو تو اس وقت ان کی نگاہوں سے جھٹکنے والا ترس اور اہردی نفرت و خدشات میں بدل چکی ہوتی۔ میرے ساتھ ساتھ خود کو بھی عزت و وقار سے محروم کر بیٹھی ہوتیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جوش سے نہیں، ہوش سے کام لینا چاہئے۔“

منور کی ماں کو جگ میں پانی لاتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا تو اسے بھی احسان ہوا کہ وہ کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہا تھا۔

گاؤں سے چار پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک پٹرول پمپ تھا۔ منور سائیکل پر جا کر

فاصلے پر کچے کچے گھر بنے ہوئے تھے۔ آگے کی جانب اسے ایک چھوٹی جھین ریسٹ ہاؤس ٹاپ کی بنی ہوئی کچی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اس کی کوشش جلد از جلد اس تک پہنچنے کی تھی۔

جب وہ اس تک پہنچا تو ایک دم ہی ماحول میں پھیلا جس اور سناٹا ٹوٹ گیا۔ ہوا میں مست ہاتھیوں کے انداز میں جھنجھ، چٹکھاتی ہوئی ہر شے کو اپنی گرفت میں جکڑنے لگیں۔ ہر طرف گرد و غبار پھیل گیا تھا۔

شازنل نے سیاہ میٹ کے پاس کاررو کی تھی۔ اس کے برابر میں چائے کا ہوٹل تھا۔ ہوٹل کا مالک انہیں پہلے ہی دیکھ چکا تھا، سو کاررو کہتے ہی دوڑا ہوا آیا۔ ہوا کی زد سے بچنے کے لئے اس نے دونوں ہاتھوں کی اوٹ میں چہرہ چھپایا ہوا تھا۔

”اندر آجائیے صاحب! اندر آجائیے۔ بڑی زوروں کا طوفان ہے۔ اللہ رحم کرے۔“

اس کے ہمراہ وہ اس ہوٹل میں آگئے جو ایک بڑے سے ہال پر مشتمل تھا۔ سامنے کاؤنٹر پر پیشہ کی چوکر برنیوں میں کیک، باقرا خائیاں اور زیرے کے بسکٹ رکھے نظر آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی چائے کے گگ اور پلاسٹک کے جگ گلاس رکھے تھے۔ کاؤنٹر کے نیچے شاید چولہا بنا ہوا تھا کیونکہ وہ دیوار پوری ڈھونکیں سے سیاہ ہو رہی تھی۔ ہال کے ایک سائید لکڑی کی میز کرسیاں بڑی تھیں۔ اندر ان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ سب طرف کا جائزہ لیتی ہوئی اس کے اشارے پر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“ شانزل اس آدمی سے مخاطب ہوا۔

”رجب علی ہے میرا نام صاحب۔“

”اچھا نام ہے۔ وجہ تلی! کوئی گاہک نہیں ہے یہاں؟ کوئی چائے پیئے آیا نہیں یا طوفان سے ڈر کر بھاگ گیا؟“ شانزل مسکرا کر پوچھنے لگا۔

”اللہ کا بہت کرم ہے صاحب مجھے گناہگار پر۔ صبح شام گامکوں سے مجھے فرمت نہیں ہوتی۔ دولہ کے بھی میرے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اس وقت طوفان کی وجہ سے سب چلے

ہارٹ فیلنگ کا انداز نہیں کر سکتی ہو۔“ وہ گفتگو کرتے ہوئے کارڈوز اٹانے لگا۔ خضر بی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

صبح سے چھایا ہوا ابر آہستہ آہستہ سیاہ گھٹاؤں کا روپ اختیار کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے چلتی ہواؤں میں شدت آنے لگی تھی۔ مگرے ابر کے باعث ماحول میں تاریکی اور وحشت اترنے لگی تھی۔

”مجھے لگ رہا ہے طوفان آنے والا ہے۔“ ایک دم پھلتے جس اور ساتوں کو دیکھ کر وہ گھبرا کر بولی۔

”اس کو تو آنا ہی ہے۔“

”مثلاً اب۔ میں کیا کہہ رہی ہوں، آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟“

”جذبات و محبت کے طوفان کی بات کر رہی ہیں نا آپ؟“ وہ معصومیت سے بولا۔

”بھئی تو اس نے نفس سے ہٹ کر بھی بات کر لیا کریں۔“ وہ بری طرح چڑھ گئی۔

”اندر کے طوفان سے زیادہ طاقت ور کوئی بھی طوفان نہیں ہوتا۔“

”جیونہہ..... آپ سے تو بات کرنا ہی فصولی ہے۔“

”گھبراؤ نہیں۔ ہم کراچی دو یا تین گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے طوفان تو یہاں آتے رہتے ہیں جو جلد ختم ہو جاتے ہیں۔“ اسے پریشان اور نگر مند دیکھ کر اس نے اذیت سے قہقہہ دی۔

خضرئی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ باہر جس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اب سڑک کے دونوں جانب باغات تھے جہاں کثرت سے آم درختوں پر لگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہرے، پیلے، سرخ آم خوبصورت لگ رہے تھے۔

موسم کی تبدیلی وہ بہت دیر سے محسوس کر رہا تھا اور حالات کے پیش نظر ہی نہایت ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ جس اور وحشت بھری پراسراریت ہوا دے رہی تھی کہ زیر دست طوفان آنے والا ہے اور وہ اس سے قبل کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں تھا۔ یہاں بہت وسیع رقبے پر آسم کے باغات پھیلے ہوئے تھے۔ آبادی تھی لیکن نہایت مختصر۔

مجھے معلوم ہوا تو میں نے کہا کہ سائیں میں یہاں چائے کا ہوٹل کھول لیتا ہوں، اس طرح یہاں سارے دن رونق رہے گی۔ رات کو میں بینک رک جایا کروں گا۔ سائیں کو یہ مشورہ پسند آگیا۔ اس طرح میں نے یہاں ہوٹل کھول لیا اور اوپر والے کے فضل و کرم سے ہوٹل خوب چل نکلا۔

”تمہارا گھر بار نہیں ہے؟“ شانزل کو اس میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

”گھر بار کیا صاحب۔“ وہ ایک مختصر سی سانس لے کر گویا ہوا۔ ”ہاں باپ بہت پہلے دنیا چھوڑ گئے تھے۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ مجھ سے چھوٹی چار بہنیں اور تین بھائی تھے۔ جیسے تیسے کر کے انہیں پالا، شادیاں کیں۔ اب بہنیں اپنے گھروں میں خوش ہیں اور بھائی اپنے بیوی بچوں میں مگن ہیں۔ سب فنی خوشی رہ رہے ہیں۔ سال چھ مہینے میں کچھ دنوں کے لئے جاتا ہوں، جو کچھ جمع کرتا ہوں بانٹ آتا ہوں۔“

”تم نے شادی کیوں نہیں کی؟“

”اس عمر میں کون مجھے بیٹی دے گا صاحب۔ جب عمر تھی تو قرآن فی لور ذمہ داریوں کے احساس نے کبھی اپنے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔“

”عمر سے کچھ نہیں ہوتا۔“ خضرئی کو اس پر ترس آگیا۔ وہ بولی تو شانزل اس کی بات قطع کر کے بولا۔

”ہاں، جیب میں نوٹ ہونے چاہئیں۔ بہت لڑکیاں مل جاتی ہیں۔“

”جی نہیں۔ ایک شریک حیات کافی ہوتی ہے مرد کے لئے جو شوہر کو گھر کا آرام و سکون دے۔ شریف و عزت دار مرد کی زندگی میں ایک عورت آتی ہے بیوی بن کر جس کی خوشی شوہر کی خدمت میں اور سکون اس کی دفا میں ہوتا ہے۔ حیرت ہے بھائی، بہن جیسے مقدس اور اصول رشتے بھی اب خود غرضی، مفاد پرستی کے اندھیروں میں گم ہو چکے ہیں ورنہ انہیں خود احساس ہونا چاہئے آپ کا۔“ خضرئی کے لہجے میں ہمدردی محسوس کر کے رجب علی خاصا حائر ہوا تھا۔

مجھے ہیں۔“ رجب علی نے سادگی سے پوری تفصیل اس کے گوش گزار کر دی۔

”ایسے طوفان یہاں اکثر آتے رہتے ہیں یا کبھی کبھی آتے ہیں؟“ شانزل نے کھڑکی سے باہر گرد آلود منظر دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”اس موسم میں اکثر آتے رہتے ہیں۔“

”اس طرح تو فصلوں کا بڑا نقصان ہو جاتا ہوگا؟“

”ہاں صاحب، بس کیا کریں، سب اوپر والے کی مرضی ہے۔“

”کتنی دیر تک رہتا ہے ایسا طوفان؟“ خضرئی نے پہلی بار لب کشائی کی۔

”ان کی کیا ڈائریکٹ ”اوپر“ سے لائن ملی ہوئی ہے جو انہیں وقت کے تعین پر گرفت حاصل ہو؟“ شانزل فس کر گویا ہوا۔ اس کے مسخرانہ انداز پر خضرئی کے ماتھے پر تل پڑ گئے تھے۔ وہ ایک نگاہ پر ہم سی ڈال کر رہ گئی۔ جبکہ رجب علی کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی لیکن اسے پُر سکون، مطمئن اور بے غوفی سے جیتے دیکھ کر حیرانی سے بولا۔

”اتنا زبردست طوفان ہے، آپ کو ڈر نہیں لگ رہا؟“

”میری زندگی میں اس سے زیادہ بھیانک اور خطرناک طوفان آتے رہتے ہیں۔ عادی ہو گیا ہوں خطروں سے گزرنے کا۔“ وہ گہری نگاہوں سے خضرئی کی جانب دیکھتا ہوا کہنے لگا۔ اس بار اس دیہاتی کی شاید امت نہ ہوئی مزید سوال کرنے کی کہ وہ دوسری بات کر رہا تھا جو اس سادہ ذہن کے بندے کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

”ریسٹ ہاؤس کی چابیاں کس کے پاس ہوتی ہیں؟“

”ریسٹ ہاؤس کی چابیاں چھوٹے سائیں کے پاس ہوتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی آتے ہیں جب زمینوں کا کوئی معاملہ ہو جاتا ہے۔ اس کی صفائی، سترائی کے لئے بندے آتے ہیں ایک دو ہفتوں میں۔ بڑے سائیں سال میں ایک مرتبہ آتے ہیں۔“ رجب علی نے حسب عادت پوری تفصیل بیان کی۔

”دھمپیں یہاں ہوٹل کھولنے کی اجازت کیسے مل گئی؟“

”ایک مرتبہ یہاں چوری ہو گئی تھی۔ بڑے سائیں کو کسی چوکیدار کی ضرورت تھی۔“

اور یادیں لایا کرتا ہے۔ اس وجہ سے اسے یہ موسم پسند نہیں تھا۔ اس سے بھی اتالی کی یاد
دل میں چٹکیاں مٹی لینے لگی تھی۔ وہ اس کی پریشانی سے بے خبر یہ سوچ کر مطمئن ہوں گی
کہ وہ ثانیہ کی شادی انجوائے کر رہی ہے۔

”اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ میں یہاں اس وحشی بھیڑیے کے کتے میں پھنسی ہوئی
ہوں تو کیا ہوگا؟ جس شخص کی پرچائیں سے بھی میں گریزاں تھی، آج اس کے ساتھ
ہوں تو کیا ہوگا؟ وہ اس حقیقت کو برداشت کر پاؤں گی؟ شاید نہیں۔ نہیں۔ میں کسی
صدمے کو برداشت کرنے کی تحمل نہیں ہو سکتی۔ اسی جان کو کھونے کے بعد اتالی کی
جدائی ہرگز برداشت نہیں ہوگی۔“ اس نے گھبرا کر سوچا۔

موسم نے نئی کروٹ بدلی اور بارش میں شدت کے ساتھ ساتھ آسمان پر گرج چمک
بھی زور شور سے شروع ہو گئی۔

واپسی کے سارے راستے بند ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ نیبے جان ہونے جسم کو
تھکیت کر کرکری پر بیٹھ گئی۔

رجب علی لائین صاف کر کے جلا رہا تھا کیونکہ کمرے میں خاصا اندھیرا پھیل گیا
تھا۔ لائین جلی قومی کے تیل کی ناگوار بو اور چینی سے نکلنے والے زرد اجالوں نے ماحول
کو کسی آسیب زدہ ویرانے کا حصہ بنا ڈالا تھا۔ مدھم نا تو ان روشنی نے وہاں رکھی اشیاء کے
سائے بھی لمبے کر دیئے تھے۔ خود رجب علی کا سایہ دیوار سے اونچا جا رہا تھا۔

وہ پریشان ہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اتنا نحوست بھرا اور وحشت زدہ ماحول تھا کہ اس
کا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں سے اٹھ کر باہر بھاگ جائے۔ اتنی دور کہ کوئی ڈھونڈنے کے
باوجود بھی نہ ڈھونڈ پائے۔

رجب علی بکیزا سیٹا بھر رہا تھا۔ شازل نا معلوم سو گیا تھا یا یونہی چہرے پر ہاتھ
رکھے دھری کرکری پر پاؤں پھیلائے آگے بڑھ کر بندھے لیٹا تھا۔
اندر صرف پادلوں کے گرہنے اور بارش کی آوازیں تھیں۔
شازل اور رجب علی کے درمیان شاید باتوں کا اسٹاک ختم ہو گیا تھا۔

”چائے والے بھی پلاؤ گے رجب علی یا باتوں سے ہی۔“
”کیوں نہیں صاحب، انہی دو دو تپتی بنا کر لاتا ہوں۔“ وہ بہت جوش سے اٹھا اور
چلے جانے لگا۔

باہر ایک دم ہی سوئی سوئی بوتلیں پرانی شرور ہو گئیں جس سے ہوا کے طوفان میں
کئی واقع ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے زبردست بارش شروع ہو گئی تھی۔

”آف۔۔۔ بہت تیز بارش ہے۔ اب نہ معلوم کب بند کرے۔“ غصہ لے کر کھڑکی سے
جھانکا تو کچھ دور کھڑے شازل سے پریشانی سے بولی۔

”کیا حرج ہے اگر نہ بھی رے تو۔“ اس نے دلچسپ نگاہوں سے اس کے پریشان
چہرے کو دیکھتے ہوئے سر کوٹھکی۔

”سنا ہے اس برسات کے موسم میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ رونے ہوئے کو قریب
لے آتی ہے۔ دو قلب کو ایک جاں کر دیتی ہے۔“ اس کی آواز خمار آلود تھی۔

”اپنی حد میں رہیں آپ۔“ وہ غصہ سے ہونٹ سکڑ کر گویا بولی۔

لفظ چھین جائیں فقط منہ میں زبان رہ جائے

جس طرح تیر چلے اور کہاں رہ جا۔

آؤ دو چار گھڑی بیٹھ کر دکھ سکے ہائیں

جانے اس بھیڑ میں پھر کون کہاں رہ جائے

بہت گھیر لپچے میں شازل نے اشعار پڑھے تھے۔

”صاحب! چائے کے ساتھ میسرے، بسکٹ وغیرہ کچھ لیں گے؟“ رجب میر پر
چائے رکھتا ہوا پوچھنے لگا۔ دونوں نے ہی منہ کر دیا تھا۔

چائے کے دوران دونوں کی گفتگو جاری رہی تھی۔ وہ خاموشی سے کپ لے کر کھڑکی
کے قریب آ گئی تھی۔ باہر بارش سے جل قتل ہو رہی تھی۔ گہرے بادل جن کی وجہ سے

اندھیرا سا پھیل گیا تھا ان کے تیور بتا رہے تھے کہ یہ جلد قابو آنے والے نہیں ہیں۔ اس
کے اندر تک سناٹا پھیلتا چلا گیا۔ بارش کا موسم ویسے بھی اپنے اندر بہت ساری اداسیاں

ذریعہ ہم کراچی جا سکیں؟“ چائے کے سب لیتے ہوئے وہ اس سے مخاطب ہوا۔ اس کے لہجے سے سنجیدگی جھلکے لگی تھی۔

”یہاں جتنے بھی راستے ہیں وہ اب دریا بن چکے ہوں گے اور ایسے میں گاڑی چلانا بہت خطرناک ہے۔ آپ صبح تک رُک جائیں۔ بارش بند ہو تو آپ چلے جائیے گا۔“ رجب علی نے خلوص سے مشورہ دیا۔

”نہیں، ہم رات یہاں کیسے رُک سکتے ہیں؟“ دو سخت متوجش ہوئی۔

”مجبوری ہے جی۔ دیکھیں تا بارش کتنی زوروں کی پڑ رہی ہے۔ رات بھی ہو گئی ہے اور راستے ویسے بھی جانے پہچانے نہیں ہیں آپ کے۔“

”تمہاری بات درست ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ رات اس طرح کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے نہیں گزر سکتی۔ کہاں رہیں گے ہم لوگ؟“

”رینٹ ہاؤس کے ایک کمرے کی چابی ہے میرے پاس۔ عام حالات میں، میں کبھی یہ چابی کسی کو نہیں دیتا۔ کیونکہ بڑے سائیں نے مجھ سے یہ عہد لے کر چابی دی تھی کہ اس کمرے کو میں تبھی استعمال کروں گا جب میرے گھر والے مجھ سے ملنے آئیں گے۔ یعنی میں مستقل اپنے استعمال میں نہیں لاسکتا تو جب بھی کوئی بہن، بھائی ملنے آتا ہے تو میں وہ کمرہ استعمال کرتا ہوں۔ اس وقت آپ لوگ بھی مجھے اپنے سگوں کی طرح ہی لگ رہے ہیں تو میں وہ چابی آپ کو دے دیتا ہوں۔ آپ لوگ وہاں رُک جائیں۔“

”بہت بہت شکریہ یار! تم نے بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ لیکن تم کہاں سوتے ہو؟“ اس سے چابی لیتے ہوئے شانزل نے استفسار کیا۔

”براہر بیٹھک میں میرا پلنگ پڑا ہے، میں وہیں سوتا ہوں۔“

”جھینکس گاڈا! یہ بڑا مسئلہ تو حل ہوا۔ چلو تم بہت تھک گئی ہو، فوراً آرام کر لو۔ صبح دیکھیں گے کیا صورت حال ہوتی ہے۔“

وہ چابی لے کر اس کے نزدیک آ کر کہنے لگا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی

”آپ لوگوں کو پانے پنا کر دوں؟“ شاید اس نے بھی اس وحشت ناک خاموشی کو توڑنے کی غرض سے پوچھا۔

”نہیں یار! ایک تو پہلے ہی بن بلائے مہمان بن کر تم پر نازل ہو چکے ہیں۔ اب اگر اس طرح فرمائشیں کریں گے تو کہیں اس ٹھکانے سے بھی محروم نہ ہونا پڑ جائے۔“ شانزل آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر سیدھا بیٹھتا ہوا مسکرا کر بولا۔

”نہیں، نہیں صاحب۔ ایسا بھلا کس طرح ہو سکتا ہے۔ بہت عرصے بعد لگ رہا ہے میں اپنوں کے درمیان ہوں۔ اب تو آپ کو پانے پینے پڑے گی۔“ رجب علی جوش سے بولا اور تازہ چائے بنانے لگا۔

”پلا دو یار! اتنی محبت سے کوئی زہر بھی پلائے تو پی لیتا چاہئے۔“

”جو محبت کرتے ہیں وہ زہر کہاں پلاتے ہیں صاحب۔“

”واہ! تم نے کبھی محبت کی ہے رجب علی؟“

”ہاں۔ مجھے اپنے بہن بھائیوں سے اور ان کے بچوں سے بہت محبت ہے بلکہ

بہنوں میں تو میری روح بہتی ہے۔“

”اس کے علاوہ کسی لڑکی سے محبت نہیں ہوئی؟“ وہ فہم کر بولا۔

”نہیں۔ وقت ہی نہیں ملا کبھی۔“ رجب علی اس قدر شرما کر بولا کہ شانزل کو شش کے باوجود اپنے تہمتوں پر قابو نہ رکھ سکا۔

”مسٹر شانزل خان آنریری! گھنیا گھٹو کرنے سے قبل یہ بھی دیکھو کہ تمہارے درمیان ایک تیسری ہستی بھی موجود ہے جو تمہاری صنف سے تعلق نہیں رکھتی۔ مہربانی فرما کر اپنی زبان کو شرافت و اخلاقیات کے دائرے میں لاؤ۔“

اسے پٹری سے اترتے دیکھ کر حضری، رجب علی کے خیال سے انگٹس میں گویا ہوئی۔ اس لمحے رجب علی چائے ان دونوں کے آگے رکھ چکا تھا۔ شانزل نے مسکراتی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔

”وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے۔ یہاں ایسا کوئی راستہ ہے رجب علی جس کے

سے اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ رجب علی کے ہمراہ طویل راستہ عبور کر کے وہ کمرے میں پہنچے جو اوپر واقع تھا۔ فرش پر واٹ چاندنی بھی ہوئی تھیں اور دیواروں کے سہارے گاؤں کی رکھے ہوئے تھے اور ایک طرف کھیں رکھے نظر آ رہے تھے۔ رجب علی نے لائین ایک مخصوص جگہ پر رکھ دی تھی۔

”کمرہ تو بہت صاف ستھرا ہے۔“ شانزل نے جائزہ لے کر رجب علی سے کہا۔

”میں روزانہ صفائی کرتا ہوں یہاں کی۔ اب جی آپ آرام کرو۔ میں کھانے کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”میں بھی آ رہا ہوں، جہیں تمہاری میں ڈر تو نہیں لگے گا؟“ شانزل بولا۔

”نہیں۔“ اُس نے سپاٹ لیجے میں کہا اور چل اٹار کر چاندنی پر بیٹھ گئی۔ رجب علی کے جانے کے بعد شانزل بھی چلا گیا تو کچھ دیر وہ موقوف ذہن کے ساتھ لائین سے نکلنے والی زرد روشنی کو دیکھتی رہی۔ وہ ایک کے بعد ایک نئی مشکل کا شکار ہو رہی تھی۔ ان مشکلات و حادثات سے فرار کہاں ممکن تھا اس کے لئے۔

شانزل کو گھنے خاصی دیر گزر چکی تھی۔ ایک ہی زاویے سے بیٹھے بیٹھے اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔ گاؤں کی گھسیٹ کر کچھ دیر بعد اٹھنے کا ارادہ کر کے لیٹ گئی۔

باہر بارش کی حشر سامانیاں جاری تھیں۔ گرج چمک میں کچھ کی واقع ہوئی تھی۔ ساری تھکاوٹ اور بے سکونی خند بن کر اس پر غالب آئے گی۔ اس کا سونے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے، شانزل کی نگاہوں میں چمک بڑھتی جا رہی ہے اور وہ اسے کوئی موقع فائدہ اٹھانے کا فراہم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کافی دیر تک نیند بھگانے کے لئے جدوجہد کرتی رہی، لیکن کب تک؟ نیند سے بھی کوئی جیت سکا ہے؟ کسی کمزور لمحے میں نیند اُس پر قابو پا چکی تھی۔ وہ ارد گرد سے بے خبر سو رہی تھی۔

اچانک ہی دل دھلادینے والا دھماکا ہوا تھا..... آواز اتنی شدید تھی کہ وہ چونہ معلوم کب سے بے خبر سو رہی تھی، گھبرا کر بیدار ہو گئی۔

آنکھیں کھولنے کے بعد متوحش انداز میں اس نے اپنے اپنے ہی گردن اور اُدھر گھمائی۔ لائین سے نکلتی زرد روشنی غائب تھی۔ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ باہر بارش طوفانی شدت اختیار کر گئی تھی۔

مٹا اُسے وہاں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا اور احساس ہوتے ہی اس کے ذہن میں چھٹکا ہوا تھا۔ ”آہ..... میں کیوں سوئی؟“ اُس نے وحشت زدہ ہو کر اٹھنا چاہا۔

”کیا ہوا؟“ اندھیرے میں شانزل کی آواز بہت قریب سے ابھری تھی۔!



”اسٹوپڈ نہیں بنو خضرئی! خدا کے لئے میری بات سنو، تم غلط سمجھ رہی ہو۔ شاید لائین میں تیل ختم ہو گیا ہے۔ اسی لئے بجھ گئی ہے۔“ اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”قریب مت آؤ۔۔۔۔۔ قریب مت آؤ۔“ اُسے آگے بڑھتے دیکھ کر وہ ہندیالی انداز میں چیخنے لگی تھی۔ شانزل ایک جست میں اُس کے قریب پہنچا تھا اور تیزی سے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر غرایا۔

”پاگل نہیں بنو۔ نیچے آواز جائے گی تو رجب علی کیا سوچے گا۔“ لیکن اس وقت وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ جیسے ہی اُس نے منہ سے ہاتھ ہٹایا، دونوں ہاتھوں سے اُس کے چہرے پر حملہ کر دیا تھا۔

”کیا کر رہی ہو؟ اوہ۔۔۔۔۔ اسٹوپڈ گرل۔“ وہ گھبرا کر دور ہٹا تھا۔ اتنی دیر میں اندھیرے سے آنکھیں مانوس ہو گئی تھیں۔ خضرئی کے ہاتھوں نے اس کے چہرے پر خراشیں ڈال دی تھیں جن میں جلن محسوس ہونے لگی تھی۔

”بات سنو میری۔۔۔۔۔ پاگل مت بنو۔“ اس وقت خضرئی بالکل ہوش و حواس سے بے نیاز نظر آ رہی تھی اور محسوس ہو رہا تھا کہ کبھی لمحے وہ خود کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

”میں تمہیں تمہارے گھنٹیا ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“

اُس نے شیشے کا گلاس اٹھا کر پھرتی سے دیوار پر مار کر توڑا اور قریب تھانوں نے گلاس سے اپنی کلائی کی رگ کاٹ لیتی، شانزل نے ہاتھ پکڑ کر وہ ٹوٹا گلاس نیچے پھینکا اور شدید فیسے سے بھرپور تھپس اس کے رخسار پر مارا۔

”اسٹوپڈ، جان دینا چاہتی ہو؟ حد ہوتی ہے بدگمانی اور احتیاط۔ پن کی۔ تمہاری محدود عقل میں جو بات پہلے دن سے سائی ہے اسی سوچ میں ہر وقت، ہر لمحہ گم رہتی ہو۔ اگر مجھے تمہیں اسی طرح حاصل کرنا ہوتا تو کیوں خواہ مخواہ دو دن اور تین راتیں خوار ہوتا؟“

اُس کے غصے میں کمی نہیں ہوئی تھی، بری طرح لہجہ درشت تھا۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تمہیں اس طرح لانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تمہاری طویل بے ہوشی کے باعث مجبوراً لانا پڑا کہ وہاں دشمنوں میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مگر

”ذرا گھبریں؟ دور نہیں بھی بُری ہے۔“ اسی دم بجلی بھرپور انداز میں چمکی تھی۔ اس نے دیکھا، وہ خنوں کے ہاں اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور پوری طاقت سے اسے دور دھکیلا۔ اس کے لئے خضرئی کی یہ حرکت غیر متوقع تھی۔ وہ بے اختیار گرا تھا۔

”اورے کیا ہوا؟ یہ کیا کر رہی ہو؟“ وہ سخت حیرانی سے گویا ہوا۔

”ذلیل انسان! میری نیند سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے؟ میں زندہ نہیں چھوڑوں گی تمہیں۔“

آخر کار وہ وقت آن پہنچا تھا جس سے وہ خوفزدہ تھی۔ جس کی خاطر اس نے ہر طریقے سے راہ ہموار کی تھی اور اب کامیاب ہوا چاہتا تھا۔ اس لمحے اس نے اپنے عزم کو دہرایا تھا کہ آہرہ ہاتھ لڑکی کی حیثیت سے ایک فاختہ کی طرح زندگی گزارے گی یا عزت و ارمیت کو گلے لگائے گی کیونکہ اس مضبوط مرد سے مقابلہ کرنا اس کے اختیار میں نہ تھا۔

”خضرئی! گھبراؤ نہیں، کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔“ اُسے سخت وحشت و جنون کی حالت میں کھڑے ہونے دیکھ کر وہ پریشانی سے گویا ہوا۔

”لائین کیوں بھائی تم نے؟ میری تہائی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو؟ مجھے کمزور اور بے بس سمجھتے ہو؟ اونہہ، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ تم نے ابھی تک دولت پر سب کچھ لاد دینے والی لڑکیاں دیکھی ہیں مگر ایسی لڑکیاں نہیں دیکھیں جو گھریلو مجبوریوں کے باعث تم جیسے ہوں پرستوں کی ملازمتیں تو کرتی ہیں مگر کسی قیمت پر عصمت فروخت نہیں کرتیں۔“

تھیں میری بات پر یقین نہیں آیا، ابھی تک یہی سمجھ رہی ہو کہ میں انہما کر کے لایا ہوں اور موقع دیکھ کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سوچو، کچھ عقل کو بھی استعمال میں لاؤ۔ اگر مجھے یہی سب کرتا ہوتا تو مجھے وہاں وجاہت سومر کی حویلی میں کیا قہارت تھی؟ کون میرا راستہ روک سکتا تھا وہاں۔ تم جو دروازہ اندر سے لاک کر کے سمجھ رہی تھیں کہ اب کوئی اندر نہیں آ سکتا تو یاد رکھنا، ایسی جگہوں پر بہت سے خفیہ دروازے ہوتے ہیں۔ میں کسی دروازے سے بھی اندر آ سکتا تھا اگر مجھے یہی سب کرتا ہوتا۔ بہت سے مواقع تھے مگر میں کبھی مجبوریاں نہیں خریدتا۔ کھرا اور صاف ستھرا سودا پسند کرتا ہوں، ٹیرا نہیں ہوں۔“

وہ چند لمحے خاموش ہوا، نیچے گرا ہوا اس کا دوپٹہ اٹھا کر اس کے ساکت و صامت وجود پر ڈال دیا۔ کمرے میں ایسی ہی خاموشی چھا گئی جو طوفان کے بعد چھاتی ہے۔ خضریٰ ٹخنوں میں منہ چھپائے خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ کبھی کوئی حیرت انگیز فضا میں گونج اٹھتی تھی۔ باہر بارش مسلسل ہو رہی تھی۔

”کب تک رونے کا ارادہ ہے؟ میں نے فریج آلیٹ بنائے تھے گرم گرم، یہاں ڈنر بھیجا تھا۔ رجب علی لے کر آیا تو تم سو رہی تھیں۔ اس سے باتوں میں کافی وقت گزر گیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ تم بھوکی ہو۔ یہاں آیا تو کمرے میں اندیرا پھیلا ہوا تھا اور اسی دم باہر کہیں بجلی مری تھی۔ تم چیخ کر اٹھ بیٹھیں، میں سمجھا تم نیند سے بیدار ہونے کے باعث خوفزدہ ہو گئی ہو۔ سو تمہیں تسلی دینے کے لئے تمہاری طرف بڑھا تھا اور تم.....“ اس نے طویل سانس لے کر بات قطع کر دی۔ ”یقیناً تمہیں میرا یہ سچ بھی کوئی جھوٹی اسٹوری لگ رہا ہو گا۔ کیونکہ میں تمہاری سوچوں سے، طبیعت سے واقف ہو گیا ہوں اور از حد افسوس ہے تمہاری محدود سوچ اور کم فہمی پر۔ بہت غربت کا شکار ہو اس معاملے میں۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ خضریٰ کی پوزیشن میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”میں باہر ٹیکری میں ہوں، کھانا کھا لو ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اگر چاہو تو اندر سے بند کر

لینا۔“ وہ کہہ کر سیدھا کمرے سے نکل گیا۔

بارش دوسرے دن صبح تک لانی برقی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ دوپہر تک کم ہوئی تھی۔ شانزل نے بھی فوراً رجب علی کو فضا حافظ کہا تھا۔

بارش بند ہو چکی تھی۔ صرف دھیمی پھوار گر رہی تھی۔ طوفان کے زور سے کئی جگہوں پر درخت کی شاخوں سے بنی ہوئی جھونپڑیاں ٹوٹ کر بکھری ہوئی تھیں۔ بارش کے باعث راستہ بہت خراب ہو گیا تھا۔ سڑک پر کئی جگہ گڑھے پڑ کر ان میں پانی بھر گیا تھا۔ چکنی مٹی نے سڑک پر پھسلن پیدا کر دی تھی۔ شانزل بہت محتاط انداز میں کارڈرائیو کر رہا تھا۔

رات سے اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ عجب سرد مہری و بیگانگی خضریٰ کے رویے میں در آئی تھی۔ شانزل نے بہت کوشش کی اس خاموشی کو توڑنے کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ کار خیزی سے کراچی کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔

”جھینکس گاڈا یہاں کا موسم خراب نہیں ہے۔“ شانزل نے سپر ہائی وے پر کار دوڑاتے ہوئے خضریٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”ابھی تک ناراض ہو؟ حیرت ہے، آپ اس قدر ضدی و خود سر ہوں گی، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں بے قصور ہونے کے باوجود ایکسکیوز کر رہا ہوں پھر بھی آ.....“

”آپ مجھے یہیں اتار دیں۔ یہاں سے میرا گھر قریب ہے، میں چلی جاؤں گی۔“ کاروائنٹ پال کے قریب سے گزرتے دیکھ کر وہ بولی۔

”گھر تک پہنچا دوں گا۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”نہیں، یہ میری عزت اور وقار کا معاملہ ہے۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔“ وہ خیزی سے دونوک لہجے میں کہہ اٹھی۔

”پہلے لہجے کر لیتے ہیں۔ صبح بھی تم نے صرف چائے پی تھی۔“

”نہیں۔ میں صرف گھر جاؤں گی۔“

”اتنی آسانی سے؟“

”اگر اب تم نے میرے لئے کوئی مشکل پیدا کرنے کی کوشش کی تو دیکھ لینا اپنا

نے انا بی کی آمد کا بھی انتظار نہیں کیا۔ کھانے اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد بخار گندم سر چڑھ کر بولنے لگا تھا اور وہ پلنگ پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گئی۔

ملازم نے ٹرائی ایک طرف رکھی اور طائرانہ نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ سرکاری کارپٹ پر جگہ جگہ چلی ہوئی سگریٹوں کے تھڑے نکھرے ہوئے تھے۔ اور وہ بیڈ پر بڑے بے ترتیب انداز میں بے خبر سو رہا تھا۔ عارفین نے جو اس کا خاص ملازم تھا اور اس سے شدید محبت کرتا تھا، بڑی رنجیدگی سے اپنے مالک کی سمت دیکھا تھا۔ وال کلاک کی سوئیاں دس کے ہند سے پر براجمان تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں سے بھاری پردے ہٹائے تو کمرہ روشنی سے بھر گیا ورنہ دیز پر دوں کے باعث رات کا گمان ہو رہا تھا۔

”صاحب..... صاحب جی.....!“ اس نے تھوڑا سا جھک کر مودبانہ لہجے میں اسے کئی آوازیں دیں۔

”ہوں.....!“ اس نے آنکھیں بند کئے ہوئے کہا۔

”صاحب! اٹھ جائیے۔“

”کیوں؟“

”صبح ہو چکی ہے۔ آپ نے کہا تھا، دس بجے آپ کو جگا دوں۔“

”صبح ہو گئی؟“ عیند سے جو جھل پلکیں اس نے بمشکل کھولیں۔

”جی صاحب۔ بڑے صاحب بھی آپ کا کل سے پوچھ رہے ہیں۔ اب تو دفتر چلے گئے۔“

”چائے دو۔ بہت خالم ہو عارفین یار تم۔ بڑی مشکل سے دو دن بعد نیند مہربان ہوئی تھی۔ تم نے فوراً ہی بھگا دیا۔“ اس نے نیم دروازہ ہو کر چائے کا گگ پکڑتے ہوئے کہا۔

”معافی چاہتا ہوں صاحب! اگر آپ مجھے وقت پر اٹھانے کا حکم نہ دیتے تو میں ایسی

انجام بھی۔“

”ہا، ہا..... میری بھی یہی خواہش ہے کہ میرا انجام تمہارے ہاتھوں ہو۔“ وہ جس کر بولا۔ چند لمحے اس کا جارحانہ تیور دیکھتا رہا پھر ایک سائیڈ میں کار روک دی۔

”جانے سے پہلے وعدہ کر کے جاؤ۔ کب ملو گی؟ آئی مین، احسان کا بدلہ کب اتارنے آؤ گی؟“

”کبھی نہیں، سمجھے؟“ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے غرا کر کہا اور ساتھ ہی قریب سے گزرتے رکشے کو روکا اور سرعت سے کار سے نکل کر رکشے میں بیٹھ گئی۔ شانزل کی جانب اس نے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

شانزل ہونٹ پیچھے رکشے کے پیچھے اڑتی دھول کو دیکھتا رہ گیا۔

”یا اللہ! میں فکا گئی۔ میں با عصمت واپس آ گئی، آپ کا بہت کرم ہے، بہت احسان ہے یا رب العالمین! مجھے گناہ گار بندی پر بہت بڑا کرم ہے۔“ گھر آتے ہی اس نے غسل کر کے کپڑے بدلے اور جانا نماز بچھا کر نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب گھر آئی تھی تو انا بی گھر میں نہیں تھی۔ دروازے میں باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ ایسا تب ہوتا تھا جب وہ پڑوس میں گئی ہوتی تھیں۔ اور وہ یہی چاہتی تھی کہ اس وقت انا بی سے اس کا سامنا نہیں ہو کہ کس طرح اپنا بھرم رکھ پائے گی۔ اس وقت تو اس وحشی کے حصار سے با عزت نکل آنا اس کے لئے کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

دل و دماغ پر چھایا گزرے وقت کا غبار آنسوؤں کے ذریعے بہ گیا تو طبیعت ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی اور شدت سے بھوک اور نیند محسوس ہونے لگی۔ لیکن میں انا بی، وال چاول پکا کر رکھ گئی تھیں اور ایک ڈش میں آم کا اچار رکھا ہوا تھا۔ اپنا پسندیدہ کھانا دیکھ کر اس کی طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ کھانا نکالنے سے قبل اس نے چوبے پر چائے کا پانی رکھا، بھر کھانا نکال کر وہیں بیٹھ کر کھانے لگی۔ بھوک کچھ ایسی ہی زوردار تھی کہ اس

لے کر یولیس۔

”اچھا ہوا، ایسے بدکردار آدمی کے ساتھ کب تک گزارا کر سکتی تھیں۔ ملازمت ہماری ضرورت سہی مگر عزت اس سے زیادہ ضروری ہے۔“

”اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ گھر سے باہر یہ سارا وقت میں اس بدکردار شخص کے ساتھ گزار کر آئی ہوں، وہ بھی باعزت تو آپ کو میری زبان اور اس کی شرافت کا یقین آ جائے گا؟“ اس نے انا بی کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا۔

”اچھا۔۔۔ تو یہ فکر تم پر سوار ہے، تب ہی اس قدر خاموش و پریشان دکھائی دے رہی ہو۔ کوئی بات نہیں، ایک در بند ہوتا ہے تو کئی در کھل جاتے ہیں۔ روزی دینے والا اپنے بندوں سے غافل ہرگز نہیں رہتا۔ بہت جلد انشاء اللہ کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔“ وہ بڑے دلار سے اس کو تسلی دے رہی تھیں۔ جبکہ یکفخت حالات کی نزاکت محسوس کر کے ان کی آنکھوں میں ٹکرات جھلکنے لگے تھے۔

”انا بی، فاخرہ باجی کے ہاں سے مجھے اس ہفتے کی تمام اخبار لا دیں۔ اردو، انگلش دونوں۔ شاید وہاں کوئی خالی دیکھنی نظر آ جائے۔“

انہوں نے پہلے اخبارات لا کر دیئے پھر پکانے کا سودا لینے بازار چلی گئیں اور وہ اخبارات پھیلانے مطلوبہ نوکری تلاش کر رہی تھی۔

ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزارنے کے باوجود کوئی ڈھنگ کی نوکری کا اشتہار موجود نہیں تھا۔ اس نے بد دل ہو کر اخبارات ایک جانب رکھے اور کچن کی جانب بڑھ گئی۔ انا بی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ اس نے آنا نکال کر گوند حنا شروع کر دیا۔ فارغ ہوئی تو اسی دم انا بی آ گئیں۔ وہ پکانے کے لئے قیمہ پالک لے آئی تھیں اور ایک لفافے میں گرم سموے۔

”لو، کھالو۔ ناشتے میں بھی صرف چائے پی ہے۔“ وہ پلیٹ میں سموے نکال کر اس کی جانب بڑھائی ہوئی کنبے لگیں۔

”کھانا آج میں ہی بناؤں گی۔“

”جیسی، تم آرام کرو۔ یہ کام میرا ہے۔“

”آپ اس عمر میں آرام نہیں کرتیں اور مجھے آرام کر رہی ہیں۔“ سموے کھاتے ہوئے وہ ہنس کر یولی۔

”یہ چند روز ملے ہیں تو آرام کر لو۔ ورثہ صبح سے رات تک کہاں آرام نصیب ہو گا۔“ انا بی نے اسے کچن میں نہیں جانے دیا اور خود بھی بہت جلد پکا کر فارغ ہو گئیں۔

اس عمر میں بھی ان کی پھرتی اور تناسل قابل دید تھی۔ وہ ہر کام بہت پھرتی اور صفائی سے کرتی تھیں۔ خاص طور پر کھانا بہت مزیدار بنایا کرتیں، کسی وقت میں ان کے ہاتھ کی سلائی، کڑھائی بہت مشہور تھی۔ اب آنکھوں کی کمزور بصارت کے باعث لوگوں کے لئے سلائی نہیں کرتی تھیں مگر اپنے اور خضری کے کپڑے خود سیتی تھیں۔ خاص طور پر خضری کے کپڑوں کی ڈیزائننگ اسی طرح سے کرتیں کہ عام کپڑا بھی خاص لگتا تھا۔

جب تک وہ پکانے سے فارغ ہوئیں تو خضری گھر کی صفائی کر چکی تھی۔ وہ کچن سے باہر آئیں اور خضری کے لئے چائے کا ایک کپ بنا کر لے آئیں۔ وہ اس کا ایسے ہی خیال رکھتی تھیں جتنا ایک لائق و فائق ہونہار کماؤ پوت کا رکھا جاتا ہے۔

”کیا بات ہے انا بی، آپ کیوں اس طرح چکر لگا رہی ہیں؟“ چائے پینے کے دوران اس نے محسوس کیا وہ کچھ مضطرب سی ادھر ادھر گھوم رہی ہیں تو پوچھ بیٹھی۔

”وہ۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ دراصل مجھے جانا ہے۔“

”کہاں؟“

”وہ۔۔۔“ اس لمحے انا بی کی بوکھلاہٹ ظاہر تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کچھ چھپا رہی ہیں لیکن چھپا نہیں پا رہی ہیں۔

”وہ فاخرہ کے ہاں جاتا ہے۔ وہاں مجھے دیر ہو جائے تو گھبرانے لگیں۔“ انہوں نے لگا ہی جاکر کہا۔

”اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ چلی جائیں آپ۔“

”اچھا، میں جارہی ہوں۔ قیمہ چوبے پر رکھا ہے۔ نماز لگ جائیں، پانی خشک ہو

جائے تو بھون کر پاک ڈال دیتا۔ وہ پانی میں بھیجا ہوا ہے۔“

”اچھا۔“ اس نے ان کے جانے کے بعد اندر سے کنڈی لگا کر ایک مرتبہ بھر اخبارات کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگی۔

شاہ زیب صاحب جو بیٹے کا شدت سے انتظار کر رہے تھے، آج گزرتا دوسرا دن بھی جب اس کے انتظار میں کٹ گیا اور آنے والا نہیں آیا تو ان کے اندر بیٹے کی جانب سے تڑپ اور فکر میں شدید اضافہ ہو گیا۔ وہ اہم میٹنگ کینسل کر کے گھر چلے آئے۔

شانزل خان ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کی زندگی کا واحد سہارا۔ وہ اسے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور یہ اس کی شدید ترین محبت کی تاثیر ہی تھی جو وہ اپنا از حد قیمتی پرنس فور کینسل کر کے وطن چلے آئے اور اپنے وسیع با اختیار اثر و رسوخ کے ذریعے ان لوگوں کو کینفر کردار تک پہنچا ڈالا جو ان کے بیٹے کے دشمن بن بیٹھے تھے۔ کام کچھ ایسی سرعت اور خاموشی سے ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی تھی۔

”عارفین! شانزل کہاں ہے؟“ انہوں نے بریف کیس اسے دیتے ہوئے استفسار کیا۔

”جھوٹے صاحب اپنے کمرے میں ہیں۔“ اس نے فرمانبرداری سے کہا۔

”کمرے میں۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے اس کی؟ صبح سے اب تک کمرے میں کیوں ہے؟“ جواب کے لئے انہوں نے عارفین کا انتظار نہیں کیا اور بے قراری سے کمرے کی طرف آگئے۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی ناگوار ہونے ان کا استقبال کیا۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ حالانکہ باہر شام کی خوبصورت روشنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے چند قدم آگے بڑھ کر کھڑکیوں کے گلاسز سے پردے سرکائے تو وہاں خوبصورت اجالا بکھر گیا اور وہ سامنے بیٹھا نظر آگیا جس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی انہیں محسوس ہوا کہ گویا کسی نے ان کا دل مٹھی میں لے کر سل ڈالا ہو۔

”عارفین! پردے ڈال دو، مجھے روشنیوں کی ضرورت نہیں ہے۔“ منہ سے دھواں

خارج کرتے ہوئے اس نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔

”آپ اندھروں سے دوستی کب کر بیٹھے میری جان! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ میں کب سے تڑپ رہا ہوں اپنے بیٹے کے لئے اور یہ کیا ہو رہا ہے؟“

بڑھی ہوئی شیو، پڑھن لباس، بے ترتیب بکھرے بال اور نشے کی زیادتی سے سوئے ہوئے چوٹے، پوٹھیل انگاروں کی طرح دکھائی ہوئی آنکھیں، عجیب سی وحشت اور بے چارگی اس کے حلیے سے جھٹک رہی تھی۔ وہ افسردہ اور دل گرفتہ سے اسے دیکھتے رو گئے۔

”اوہ۔۔۔۔۔ ڈیڈی آپ؟“ باپ کو سامنے دیکھ کر وہ جلدی سے کھڑے ہونے کی کوشش میں اس زور سے لڑکھڑایا کہ اگر آگے بڑھ کر وہ اسے سہارا نہ دیتے تو وہ ٹھیل پر منہ کے بل گرتا۔

”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کیا ہوا ہے؟ کیا بھگڑا ہوا ہے کسی سے؟“ وہ اسے بازو کے گھیرے میں لے کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

”مجھے۔۔۔۔۔ سے۔۔۔۔۔ کون۔۔۔۔۔ جھگڑا۔۔۔۔۔ کر سکا۔۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔۔ ہمت۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ کسی۔۔۔۔۔ کی۔۔۔۔۔“

”اس وقت حواسوں میں نہیں ہو، بہتر ہے آرام کرو۔ صبح ملاقات ہوگی۔“

ٹھیل پر رکھی ایش ٹرے دیکھ کر ان کی پیشانی پر سلونیس پڑ گئیں۔ شانزل اس وقت نشے میں دھت تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور سران کے شانے سے چاٹا کا تھا۔

شاہ زیب صاحب نے بڑی محبت سے اس کے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور پھیرتے رہے۔ جو ان بیٹے کی ایسی حالت پر ان کے دل پر چر کے لگ رہے تھے۔

اس کے ذہنک کرنے کی عادت اور سگریٹ نوشی ان سے مخفی نہیں تھی بلکہ لڑکیوں سے دوستی، تعلقات کی نوعیت سے بھی پوری طرح باخبر رہا کرتے تھے۔ اور ان کی نگاہ میں اس کی یہ حرکتیں معیوب یا قابل سرزنش نہیں تھیں کہ جس سوسائٹی میں وہ نمود کرتے تھے،

وہاں ایسی سرگرمیاں ایشنس کا حصہ تھیں۔ روک ٹوک، پابندی کا تصور ہی نہ تھا۔ لیکن اب بیٹے کی حالت دیکھ کر انہیں محسوس ہوا کہ وہ غافل رو گئے۔

”خضریٰ... خضریٰ... خضر...“ اچانک ہی مدبوشتی کے عالم میں وہ بڑبڑایا تھا۔ پھر ایک دم پہلے کی طرح غافل ہو گیا۔

شاہ زیب صاحب چونک اٹھے۔ اس کے منہ سے کسی لڑکی کا نام سننا کوئی تعجب خیز بات نہ تھی بلکہ جس بات نے چونکایا، وہ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس سے وہ سمجھ گئے کہ اس نام کی ٹینشن سٹانزل کو جکڑے ہوئے ہے جس نے اسے اس حال کو پہنچایا ہے کہ وہ دین و دنیا سے بے نیاز باپ سے لاپرواہ شدید نشے میں بھی اس کے نام کو روت رہا ہے۔

کافی دیر وہ اس کا سر شانے سے لگائے بیٹھے سوچتے رہے پھر عارفین کو آواز دی۔
”انہیں معلوم تھا وہ حسب عادت دروازے کے پاس موجود ہوگا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ پہلی آواز پر ہی وہ اندر آ کر بولا۔

”جی صاحب!“

”اس کی مدد سے انہوں نے سٹانزل کو بیڈ پر لٹایا اور اسے کھڑکیوں پر پردہ ڈال کر باہر آنے کا حکم دے کر اپنے روم میں آ گئے۔ بیٹے کی ایسی حالت دیکھ کر انہیں اپنے سارے حوصلے ٹوٹنے ہوئے محسوس ہوئے۔ انہوں نے اس کے لئے بہت اچھے روشن خواب دیکھے تھے مگر وہ کن راستوں پر چل نکلا تھا۔ روشنیاں چھوڑ کر اندر سے دھچکیوں کی ہونٹ تھی؟

”بڑے صاحب! آپ نے مجھے بلایا تھا؟“ چند لمحوں بعد عارفین آ کر مژدہ بانہ لہجے میں بولا۔

”سٹانزل سے کون کون ملے آیا تھا؟“

”کافی لڑکیاں آئی تھیں، لیکن صاحب پہلے ہی حکم دے چکے تھے کہ کوئی آئے تو کہہ دوں صاحب گھر پر نہیں ہیں اور میں نے یہی کہا۔ سب ہی واپس چلی گئیں۔ صاحب کسی سے بھی نہیں ملے۔“

”ہوں... سب لڑکیوں کو جانتے ہو؟ ان کے نام معلوم ہیں؟“

عارفین نے ایک طویل فہرست ان کے گوش گزار کر دی سٹانزل کی گرل فرینڈ کی، مگر مطلوبہ نام انہیں نہیں ملا تو کافی وقت کے بعد وہ گہرے لہجے میں پوچھنے لگے۔
”کوئی نام بھول تو نہیں گئے؟“

”نہیں صاحب! مجھے اچھی طرح یاد ہیں اور سب کو جانتا ہوں۔“

”خضریٰ... کون لڑکی ہے یہ؟“ وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

”خضریٰ؟ اس نام کی تو کوئی لڑکی صاحب کی دوست نہیں۔“

”شیدر؟“

”جی صاحب جی! مجھے پکارتی ہیں، صاحب کی اس نام کی کوئی دوست نہیں ہے۔“

پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”ہو سکتا ہے صاحب جو ابھی کچھ دن شہر سے باہر رہے ہیں، وہاں ان کی اس لڑکی سے ملاقات ہو گئی ہو تو معلوم نہیں۔“

”پھر آج سے تمہاری ڈیوٹی ہے یہ، مجھے معلوم کر کے بتاؤ یہ لڑکی کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ کیا فیملی بیک گراؤڈ ہے اس کا؟ اور تم جانتے ہو نا اگر اس بات کی خبر تم نے سٹانزل کو کر دی تو میں تمہارا کیا حشر کروں گا؟“ انہوں نے سرد لہجے میں کہا تو وہ فوراً ہاتھ جوڑ کر خوفزدہ لہجے میں بولا۔

”میں کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

”انا بی! کہاں رہ گئیں آپ؟“ اس نے پھیلے اندر سے کود کھڑے کر پریشانی سے سوچا۔ وہ بارہ بجے گھر سے گئی تھیں اور اب مغرب کی نماز پڑھ کر وہ کافی دیر سے فارغ بیٹھی تھی۔ ان کی آمد کا دور دور تک پہنچ نہ تھا۔

اس کی پریشانی بڑھنا نظری عمل تھا۔ اس نے چادر اوڑھی اور دروازے پر باہر سے کنڈی لگا کر برابر فاخرہ کے گھر سے انا بی کو بلانے پہنچ گئی۔

وہاں فاخرہ نے بتایا کہ انا بی صبح کچھ دیر کے لئے آئی تھیں پھر دوبارہ نہیں آئیں۔ ان کے جواب نے اس کی پریشانی دوچند کر دی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں اب کہاں

دیکھے کہ محلے میں کسی سے اسے تعلقات نہیں تھے کہ وہ یوں اطمینان سے کسی کے گھر جا کر بیٹھ جائیں، جبکہ اس کی عادت کو جانتے ہوئے وہ کبھی زیادہ دیر بازار میں بھی نہیں لگاتی تھیں کہ وہ پریشان ہو کر دروازے کے چکر کاٹے گی۔

اب کہاں چلی گئیں وہ؟

کہاں انہیں تلاش کروں؟

کس سے پوچھوں ان کے بارے میں؟

فاخرہ نے بہت رد کا کہ منہ میٹھا کر کے جائے گھر اپنی پریشانی میں اس وقت اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ان سے معذرت کر کے واپس گھر چلی آئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں چلی گئیں، انہیں کدھر تلاش کرے؟ ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اتانی سسکاتی ہوئی اندر آئیں اور اسے پریشان دیکھ کر بولیں۔

”ہاں مجھے یہی فکر تھی کہ تم دروازے کے چکر کاٹ رہی ہو گی۔ جلدی جلدی کرتے بھی یہ وقت ہو گیا۔“

”فاخرہ یا جی کے بچے بہت تنگ کر رہے تھے کیا آج؟“ وہ انجان بن کر بولی۔

”پہلے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دو۔ جڑواں بچوں کو سنبھالنا آسان کام نہیں ہوتا۔ ایک تو پہلو بھگی کی اولاد اور جڑواں۔ مزید ستم یہ کہ کوئی بزرگ نہیں ہے گھر میں۔“ انہوں نے پانی پیتے ہوئے ہمدردی سے کہا اور قفل اس کے کہ وہ کچھ کہتی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ اتانی کے پیچھے وہ بھی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔

”آپ آگئیں۔ شکر ہے، فاخرہ بہت پریشان ہو رہی ہے۔ اس نے کہا پوچھ کر آؤں آپ آئیں یا نہیں؟“ دروازے پر فاخرہ کے شوہر کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر خضریٰ نے تیزی سے ان کا رنگ سفید پڑتے دیکھا تھا۔

”ہاں..... ہاں میاں! میں بھلا کہاں جاؤں گی۔“ پیچھے خضریٰ کو دیکھ کر وہ بوکھلا رہی تھیں۔

”خضریٰ بہن بہت پریشان ہو رہی تھیں۔ وہ سمجھیں کہ شاید آپ ہمارے گھر پر ہیں

اور وہاں آپ کو نہ دیکھ کر وہ اندر بھی پریشان ہو گئی تھیں۔“

”فاخرہ کو سلام کہنا، بچوں کو پیار دینا۔ گل آؤں گی کہہ دینا فاخرہ سے۔“ ان کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ گویا کسی چور کو موقع واردات پر ہی پکڑ لیا گیا ہو۔ فاخرہ کے میاں کے جاتے ہی وہ تیزی سے اندر کی کنڈی لگا کر پٹیس تو خضریٰ سے نکالیں چرا کر اندر بڑھ گئیں۔

گھر سے نکلنے وقت وہ یہ بھول ہی گئی تھیں کہ اگر انہیں واپسی میں دیر ہو گئی تو وہ فاخرہ کے ہاں انہیں بلانے پہنچ سکتی ہے اور ان کا بھرم، ان کا راز، ان کی محنت لہجوں میں عیاں ہو کر مٹی ہو جائے گی۔ اب کس طرح اسے سمجھائیں؟ کس طرح یقین دلائیں کہ وہ جو کر رہی ہیں، دونوں کی ہی مجبوری ہے۔

انہوں نے دل گرگتی سے سوچا اور فیصلہ کر لیا کہ اسے اب سچ بتا دیں۔ آج کل وہ گھر میں تھی اور نہ معلوم کتنے عرصے بعد اسے دوبارہ ملازمت ملے اور وہ روزانہ کیا کیا یہاں بنا سکتی تھیں۔ پہلے اس طرح ہوتا تھا، جہاں وہ گھر سے آفس جانے کے لئے نکلی، اس کے جانے کے کچھ دیر بعد وہ اپنا کام منٹا کر چلی جایا کرتی تھیں اور شام کو اس کے آنے سے قبل آ جایا کرتیں۔ اس طرح وہ کبھی محسوس ہی نہ کر پاتی کہ وہ روز گھر سے جاتی ہیں۔

اسے سچ بتانے کا ارادہ کیا تو دیکھا وہ کمرے میں نہیں ہے۔ وہ مہن میں نکل آئیں۔ امرود کے درخت کے نیچے چار پائی پردہ دوپٹے میں منہ چھپائے روتی ہوئی نظر آئی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھیں۔

”کیوں رو رہی ہو؟ کیا بات ہوئی میری بچی؟“ وہ اسے سینے سے لگا کر خود بھی رونے لگیں۔ مگر اس سے کچھ بولا ہی نہیں کیا۔ آنسو تو اترے بہہ رہے تھے۔

”کچھ بولو تو سہی، کیا ہوا؟“

”کہاں گئی تھیں آپ؟ سارا دن آپ کی واپسی کے انتظار میں گزر گیا۔ گھبرا کر فاخرہ بچی کے گھر سے آپ کو بلانے گئی تو وہ کہنے لگیں آپ صبح کچھ دیر کے لئے آئی تھیں اس

تیار ہو گئی۔

”اما بی! گل چھ ز سے میں نے کچھ ایسے ایڈریس نوٹ کئے تھے جہاں ملازمت ملنے کی امید ہے۔ دعا کریں بہتر جاب مل جائے۔ مجھے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔“

آپ پریشان مت ہونا۔“

”اللہ تمہیں کامیاب کرے، اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“ اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے صدق دل سے دعا دی۔

”آپ وعدہ کریں مجھ سے۔“ وہ ان کا تحفہ و نذر ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔

”کیسا وعدہ بنی؟“

”مجھے ملازمت مل جائے گی تو آپ نوکری فوراً چھوڑ دیں گی۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ یہ نوکری کیا دکھ دے رہی ہے؟“

”بہت بڑا دکھ۔ آپ نہیں سمجھتیں اما بی۔ آپ اس عمر میں بھی میری خاطر چھوڑو روپے کی خاطر کسی کی غلامی کر رہی ہیں۔ یہ احساس، یہ دکھ مجھے اندر ہی اندر کند چھری کی طرح گھاگل کئے دے رہا ہے۔ ساری زندگی آپ نے محنت کی، مشقت کی، خود کو مشین بنالیا۔ اب..... اب تو آرام کیجئے، زندگی کی راحت و مسرت پر کیا آپ کا کوئی حق نہیں ہے؟ ساری عمر یونہی محرومیوں اور مشقتوں میں گزاریں گی؟“

”اچھی خاصی تو زندگی گزر رہی ہے میری بچی۔ بیکار سوچوں کو دل میں جگہ نہیں دیا کرتے۔ زندگی کی یہ خوشیاں، یہ آرام کیا کم ہے کہ ہم صرف اللہ کے محتاج ہیں۔ رب نے ہمیں ہاتھ پیر چلانے، دماغ استعمال کرنے کی صلاحیت دی ہے ورنہ ان لوگوں سے پوچھو کہ جو کسی وجہ سے ان نعمتوں سے محروم ہو جاتے ہیں تو دولت و ثروت حاصل ہونے کے باوجود ان محسوسات سے محروم رہتے ہیں جو ہمیں حاصل ہیں۔ اور تم نے یہ کیا کہا کہ روپے کی خاطر میں کسی کی غلامی کر رہی ہوں؟ بہت غلط خیال ہے یہ۔ شاید تم یہ سوچتی ہو گی بلکہ تمہیں شرمندگی محسوس ہو رہی ہو گی یہ سوچ کر کہ میں باور چننی بنی ہوئی ہوں، ان لوگوں کا کھانا پکاتی ہوں۔ میری بیٹی! محنت میں شرمندگی و شرمساری نہیں محسوس کرنی

کے بعد نہیں آئیں۔ یہ سن کر آپ کو لفظوں میں نہیں بتا سکتی کہ میری کیا حالت ہوئی۔“ اُس نے ہچکچوں کے دوران بتایا تو انہوں نے پیار سے اسے لپٹا لیا۔

”تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گی میری بچی! تمہاری خاطر تو زندہ ہوں۔“

”کہاں گئی تھیں آپ؟ اب آپ کو کچ بٹانا ہو گا۔“

”ہوں..... میں فیصلہ کر چکی ہوں سب کچھ سچ بتانے کا۔ مگر تم کو بھی وعدہ کرنا پڑے گا کہ میری بات سن کر خفا نہیں ہوگی اور نہ ہی دل کو لگاؤ کی۔“ وہ اس کے نزدیک بیٹھ کر بے حد نرمی و شفقت سے گویا ہوئیں۔ جواب میں اس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”میں ایک گھر میں کھانا پکاتی ہوں۔ بہت اچھی ٹیلی ہے، تنخواہ بھی مناسب ہے اور پریشان بھی نہیں کرتے۔ بہت عزت دیتے ہیں۔ دیکھو اب تم خیال مت کرنا کہ میں نوکری کیوں کر رہی ہوں۔ حالات تمہارے سامنے ہیں۔ تمہاری ساری تنخواہ و رافع فیاض کو دے دیتی ہوں۔ پھر گھر میں رہنے کے لئے بھی تو رقم درکار ہوتی ہے۔ اس طرح میں نے سوچا، قرض بھی ہلکا ہو جائے گا اور سارا دن گھر میں فضاں گزر جاتا ہے تو کچھ حاصل ہی ہو جائے گا۔“

”اما بی! یہ بات آپ نے مجھ سے چھپائی کیوں؟“ اس کے ہونٹوں سے دھیمی آواز ابھری۔

”بس، اب کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک طرف پڑے پڑے تو لوہے کو بھی رنگ لگ جاتا ہے پھر میں تو انسان ہوں، اس طرح میرے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں ورنہ بیمار بن کر رہ جاؤں۔ چلو اب پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر نماز پڑھ کر سوئیں گے۔“ اپنے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اٹھالیا تھا۔ خضریٰ کچھ بولی نہیں مگر اس کا سرخ پڑتا چہرہ اور دوبارہ پھٹکتی نگاہیں اس کے اندر چھوٹی بے چینی و ناپسندیدگی کا پتہ دے رہی تھیں۔

صبح نماز و تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد نیند نہیں آئی تھی۔ اما بی ناشتہ بناتے لگیں، وہ اپنے اور ان کے کپڑے نکال کر پرہیز کرنے لگی۔ پھر ناشتے سے فارغ ہو کر

”نہیں، شکایت تو مجھے اپنے آپ سے ہے۔ کیوں تمہارے بہتر مستقبل کی خاطر میں دولت کے انبار لگانے میں اس قدر محو ہو گیا کہ بیٹے کی جانی کی طرف بڑھتے قدم روک نہ سکا۔ خرابیوں، خامیوں کو اپنی اعلیٰ سوسائٹی کے قاتل سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا اور خود اپنے بیٹے کو جہنم کی طرف دھکیلا رہا۔“

”ڈیڈی! پلیز کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹریش، بھلا مجھے کیا ہوا ہے؟“

”تمہیں کچھ ہوتا بھی نہیں چاہئے ورنہ.....“

”اودہ کم آن ڈیڈی! یہ کیا آپ بھی وہ منہ کی طرح ایسٹبل ہو گئے ہیں۔ کچھ نہیں ہوگا مجھے۔ ناشتہ کریں، بے مزہ ہو جائے گا تو کچھ نہیں کھا پائیں گے آپ۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے سلاکس کی پلیٹ ان کی طرف بڑھائی پھر دانستہ ان سے اس انداز میں باتیں کیں کہ وہ انفرادی پریشانی بھول کر اس کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے۔

ناشتہ بہت خوشگوار ماحول میں کیا گیا تھا۔

ناشتے کے بعد شاہ زیب صاحب آفس روانہ ہو گئے۔ وہ اخبارات لے کر لیونگ روم میں بیٹھ گیا اور کافی دیر مطالعہ کرتا رہا۔ عارفین کی آمد نے اُس کی اس مصروفیت کو ختم کیا تھا۔ اخبارات ایک طرف رکھ کر وہ اُس سے مخاطب ہوا۔

”عارفین! ڈیڈی کل کمرے میں آئے تھے؟“

”جی ہاں۔“ اُس نے قریب آ کر مودبانہ لہجے میں جواب دیا۔

”ہوں، جب ہی آج اس قدر ڈسٹرب تھے۔ مجھے ذرا بھی یاد نہیں۔“

”صاحب! باہر فضلہ بی بی آئی ہیں۔ میں نے انہیں بہت دیر لے کر کوشش کی مگر وہ کہتی ہیں جب تک آپ سے نہیں ملیں گی یہاں سے نہیں جائیں گی۔“

”میں، تمہیں معلوم ہے ناکتنی ضدی ہوں۔ جو کہتی ہوں وہ کرتی بھی ہوں۔ اور مجھے یقین تھا کہ تم اندر ہی ہو اس لئے میں نے آج واپس نہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“ شوخ مسکراہٹ ریڈ لپ اسٹک سے چمکتے ہونٹوں پر سجائے پُر اعتماد انداز میں وہ اندر داخل

چاہئے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے بندہ خود ہاتھ پیر چلائے۔ محنت کرنے والوں کی عزت ہوتی ہے۔“

انہیں پہلے سے احساس تھا کہ وہ ضرور مخالفت کرے گی۔ کیونکہ رات بھر اس کی بدلتی کروٹوں سے وہ اس کا ذہنی اضطراب و بے چینی محسوس کر چکی تھی۔ انہیں معلوم تھا وہ کبھی بھی ان کی ملازمت کو پسند نہیں کرے گی لیکن گھر کے حالات اکیلے کے بس کے نہیں تھے۔ اگر مسئلہ صرف ان دونوں کا ہوتا تو خضریٰ کی تنخواہ سے یا آسانی گزارہ ہو سکتا تھا۔ مگر اصل گنیمت مسئلہ رافع فیاض کو وہ مخصوص رقم دینے کا تھا جو ہرماد کے شروع میں دینی ہوتی تھی۔ جو کبھی مجبور الیٹ ہو جاتی تو وہ بدتمیزی کرتا یہاں آ کر۔ کم از کم جب تک اس کی رقم پوری ادا نہیں ہو جاتی تب تک وہ ملازمت نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔

”آپ فیصلہ کر چکی ہیں کہ مجھے اسی طرح حائل کرتی رہیں گی؟“

”نہیں، ہرگز نہیں۔ میں ماں ہوں قصائی نہیں۔ اس وقت تمہاری ضد میں صرف بچکانہ پن ہے۔ جذبات کی دنیا سے باہر نکل کر دیکھو گی تو خود ہی وقت و حالات کی نزاکت کا احساس ہو جائے گا۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

”السلام علیکم ڈیڈی! کیسے ہیں آپ؟“ ناشتے کی ٹیبل پر وہ ہشاش بشاش سا شاہ زیب صاحب سے مخاطب تھا۔ گل کی نسبت آج وہ کافی بہتر تھا۔ لباس بھی نیا تھا، شیوہ بھی ہوئی تھی، بال سلیپ سے سنوارے گئے تھے، چہرہ بھی خاصا فریش فریش لگ رہا تھا۔ مگر آنکھیں وہی مخصوص خزن و سوز میں ڈوبی ہوئی تھیں اور اس کے مسکراتے لبوں کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

”بالکل ویسا ہوں جیسا ایک زندگی سے لاپرواہ تاریکیوں سے خشن کرنے والے بیٹے کا باپ ہوتا ہے۔“ وہ آزدگی سے بولے۔

”اودہ، یہ کیا کہہ رہے ہیں ڈیڈی آپ؟ مجھ سے کوئی شکایت ہے آپ کو؟“ سلاکس پر جیم لگتا اس کا ہاتھ رک گیا۔

ہوئی تھی اور بہت بے قراری سے اس کی طرف بڑھی تھی۔

عارفین وہاں سے چلا گیا تھا۔ شانزل نے نرمی سے اسے خود سے الگ کیا تھا۔

”ڈیزیز! ناراض ہو؟“ فتنہ نے بہت حیرانی سے اس کی اس حرکت کو نوٹ کیا۔

”نہیں۔ تم سے ناراضگی کیسی بھلا؟“

”پھر.....“

”کچھ نہیں۔ بتاؤ کیا ہو گی؟“ اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے دانستہ موضوع چھیچھی کیا۔

”جو تمہیں پتا ہو۔“ وہ ریڈ ساڑھی کا گولڈن ہارڈر پلو ایک ادا سے انگلی پر لپیٹی ہوئی

بولی۔ شانزل نے انٹرکام پر عارفین کو کولڈ ڈرنک لانے کا حکم دیا۔

”کہاں رہے اتنے دن؟ میرا تو انتظار کرنے کرتے رہا حال ہو گیا تھا۔“

”ہوں..... لگتا تو نہیں۔ بلکہ مجھے تو پہلے سے زیادہ کیوٹ لگ رہی ہو۔“ اس نے

بغور اس کی جانب دیکھتے ہوئے شوشی سے کہا۔ گہرے گلے والے بغیر استیوں کے

گولڈن بلاؤنز سے باہر اس کی گوری رنگت خوب دکھ رہی تھی۔ سیچنگ جیولری اور

مہارت سے کئے گئے میک اپ میں اس کے حسن کی شادابیاں عروج پر تھیں۔

”کبھی تو دل سے بھی تعریف کر دیا کرو ڈیزیز۔“

”تم اتنی تعریف کی بھو کی کیوں رہتی ہو؟“

”صرف میں نہیں، بلکہ ہر لڑکی یہی خواہش رکھتی ہے۔“

”کیا سب لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں؟“

”ہاں۔“

”نہیں، شاید کچھ لڑکیاں ایسی نہیں ہوتیں۔“ اس کی نگاہوں میں ایک باوقار سرپا لے

بھر کولہرا کر غائب ہو گیا اور اس کے اندر اضطراب و بے چینی دوبارہ بیدار ہونے لگی۔

”کیا ہوا؟ تم ایک دم خاموش کیوں ہو گئے؟“ فتنہ نے اس کی بدلتی کیفیت شدت

سے محسوس کی تو فوراً دریافت کیا۔

”کچھ نہیں۔ لو، تم کو لڈ ڈرنک پیو۔“ اس نے عارفین کے ہاتھ سے گلاس لے کر اس

کی جانب بڑھایا اور اپنے گلاس سے سب کرنے لگا۔

”جلدی سے کپڑے چھیچھی کرو، ہم لٹچ اور ڈنر باہر کی بہت اچھے ہوٹل میں کریں گے

اور رات.....“

”سوری فتنہ! میں آج بہت بڑی ہوں۔ کہیں نہیں جاسکوں گا۔“

”پھر کل کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔“ فتنہ کے لہجے میں تعجب تھا۔

”سوری..... نہ کل اور نہ پرسوں، بلکہ آئندہ کچھ ہفتے..... بلکہ کچھ ماہ میں بہت بڑی

رہوں گا۔ اس لئے تمہیں ٹائم نہیں دے پاؤں گا۔“

”تو..... تو..... نو امپائل۔ مجھے نہیں لگتا تم شانزل خان ہو۔ میں کیسے مان لوں تم

شانزل خان ہو؟ تم جو میرے ساتھ وقت گزارنے کے لئے ہر شے کو ٹھوکر مار دیا کرتے

تھے۔ میرے لئے تمہاری بزنس ایکٹوئیز کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں تمہارے لئے، آج

میں خود چل کر آئی ہوں تو تم مجھے بتا رہے ہو کہ تمہارے پاس ٹائم نہیں ہے میرے

لئے۔“ وہ غصے سے کھڑی ہو گئی۔

”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، ہر وقت موڈ یکساں نہیں رہتا، بدلتا رہتا ہے۔“

”تمہارا موڈ ہی نہیں بلکہ تم خود بدل گئے ہو اور اس حد تک کہ پہچانے نہیں جا

رہے ہو۔“

”بیٹھو نا، کہاں جا رہی ہو؟“

”جب تمہیں میری ضرورت ہی نہیں تو فضول ہے یہاں بیٹھنا۔“ اس نے خاصے

جلمے کئے انداز میں جواب دیا اور گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”اوکے، ایز یوش..... عارفین! اس کو احترام سے گیٹ تک چھوڑ آؤ۔“ وہ فتنہ کو

جانے کا کہتا ہوا اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا جہاں فتنہ اسے

اتنی حیرانی سے دیکھ رہی تھی گویا شبہ ہو اس کی دماغی حالت پر۔

چونکہ یاد کے جواب نے اسے مطمئن نہیں کیا تھا۔ اس کے سوال کو نظر انداز کر کے وہ آگے بڑھ گئی۔ اندر بال میں امیدواروں کی طویل قطاریں تھیں۔

وہ بھی نشست پر بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔ آدھے گھنٹے بعد فیجر صاحب نے معذرت کر لی یہ کہہ کر کہ کچھ تاخیر وجوہات کے باعث انٹرویوز کینسل کر دیے گئے ہیں۔ جلد دوبارہ کئے جائیں گے اور اس کی اطلاع اخبارات میں دے دی جائے گی۔ چند ہی معذرتی جملے کہہ کر فیجر وہاں سے چلا گیا۔ چند لمحوں قبل جو ماحول پُر سکوت تھا یکدم ہی مختلف آوازوں سے گونج اٹھا۔

”بے حسی و سنگدلی کی انتہا ہے۔ پہلے انٹرویو کے لئے بلاتے ہیں پھر فنیوٹل جھوٹی معذرت کر کے اسی طرح بھگا دیتے ہیں۔ ہمارے وقت اور پریشانی کا کوئی احساس نہیں ہے۔“ کسی کی آواز ابھری۔

”یہ سب دکھاوا ہوتا ہے۔ سیٹ تو پہلے ہی رشوت کے ذریعے فروخت ہو جاتی ہے۔“ پہلے والدین ہماری اعلیٰ تعلیم پر خرچ کرتے ہیں پھر ان نوکریوں کے چکر میں جیسیں خالی ہو جاتی ہیں۔“ وہ سب باتیں کرتے باہر نکل رہے تھے۔

خضریٰ بھی بوجھل قدسوں سے چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کتنی پُر امید اور پُر جوش ہو کر وہ آئی تھی کہ شاید آج نصیب جاگ جائیں اور کچھ تو سیدہ سحر اس کی زندگی میں نور پیدا کرے۔ مگر وقت خواہشوں اور سوچوں کے تابع نہیں ہوتا، اس کا الگ شاہانہ مزاج ہے۔ مہینہ انتہام پذیر تھا۔ اُسے فکر تھی اگر رائف فیاض کو روپے نہ بھیجے گئے تو وہ شخص گھر پر چلا آئے گا۔ پھر بھلا اس کی زبان کو کون لگام دے سکتا ہے؟

وہ اپنی سوچوں میں گم چلی جا رہی تھی۔ معا آف وہ اسٹ چھپاتی کار نے تیزی سے آ کر اس کا راستہ بلاک کر لیا تھا۔ اُس نے گھبرا کر دیکھا تو ڈرائیوگ ڈور سے جھانکتے منکراتے ہوئے شانزل کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر ناگواری کی سطوریں پڑ گئیں۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ اُس نے سخت لہجے میں کہا۔

”سوری..... آؤ میں ڈراپ کر دوں گا۔“

”پندرہ دن ہو گئے ہیں! دفتروں کے چکر لگاتے ہوئے، ہر بار ناکامی ہوتی ہے۔ میں کہہ رہی ہوں کچھ دن گھر بیٹھ جاؤ، پھر دیکھ لیتا۔ دراصل یہ کچھ حیران کن بات ہے کہ جس چیز کی ہمیں جس وقت شدید ضرورت ہوتی ہے، اسی وقت ہماری آزمائش شروع ہو جاتی ہے۔“ انانی نے ناشہ کر کے تیار ہوتی خضریٰ کو خلوص سے مشورہ دیا تھا۔

”کبھی کبھی نہیں انانی! ہماری زندگی ہی آزمائش بن کر رہ گئی ہے۔ آزمائش اور آزمائش کے سلسلے کچھ اتنے دراز ہیں کہ زندگی کا معمولی سا بھی لطف ہم نہ اٹھا سکے۔“ اُس نے حیرانچہ چلا کر بالوں کو لپیٹ کر بیٹھ کر لگائے تھے۔

”خوش نصیب ہیں ہم۔ اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کو ہی آزمائش میں ڈال کر ان کے یقین و ایمان کی پختگی کا امتحان لیتا ہے۔ اس سے یہی دعا ہے کہ وہ ہمیں ہر آزمائش میں ثابت قدم رکھے۔ آمین۔“

”انانی، میں جا رہی ہوں۔ دعا کیجئے گا کامیاب لوٹوں۔“ وہ چادر اوڑھنے کے بعد بیک کاندھے پر ڈال لیتے ہوئے بولی تو حسب معمول انہوں نے بے تحاشہ دعاؤں کے ہمراہ اسے رخصت کیا۔

وہ طویل سفر طے کر کے کوچ کے ذریعے ڈرگ روڈ پہنچی جہاں ایک پرائیویٹ فرم میں ایک مینس کا ایڈ اُس نے کل دیکھا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی لمحے بھر کو اُس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا تھا۔ جس کے تصور سے بھی وہ نالاں تھی، وہ اندر سے نکل رہا تھا۔ دھنسن اور ساتھ تھے، دونوں کا انداز بتا رہا تھا کہ یقیناً وہ اُس کے ماتحت تھے۔ خضریٰ تیزی سے قریبی ستون کی اوٹ میں ہو گئی۔ شانزل ان دونوں کے ہمراہ پچھلے سے گزرا تھا۔

اُس کا اس طرح گزرنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ وہاں اس کی موجودگی سے بے خبر رہا تھا۔ وہ شکر کرتی ہوئی گیت کے نزدیک بیٹھے چیز اسی کی طرف بڑھ گئی۔

”سنیں بابا! وہ جو صاحب ابھی گئے ہیں، وہ یہاں کیوں آئے تھے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ میں یہاں آج ہی آیا ہوں۔ لیکن آپ کیوں معلوم کر رہی ہیں؟“

”تھیکس۔۔۔ میں چلی جاؤں گی۔“

”انکار نہیں کرو، پچھلے ایک گھنٹے سے یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”کیوں؟ کس نے کہا تھا؟“

”دو لوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہے۔ میرے دل نے۔ مانتی ہوں میری باریک بین نگاہوں کو؟ تم تو خود کو ستون کے پیچھے روپوش کر چکی تھیں مگر بھول گئیں کہ ہم بھی قیامت کی نگاہ رکھتے ہیں۔“ وہ اُس کی سرد مہری کو نظر انداز کئے مسلسل خوشگواریت سے بات کر رہا تھا۔

”جی، میں بخوبی آگاہ ہوں آپ کی ان تمام خصوصی ”صلاحیتوں“ سے۔ اب برائے مہربانی مجھے جانے دیں۔“ اُس کا طعنے لہجہ عاجزانہ ہو گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اُس کی عقابانی نگاہوں کو کوس رہی تھی کہ احتیاط کے باوجود وہ اسے کھوج چکی تھیں اور وہ بہت چالاکی سے یہ بھی جان چکا تھا کہ وہ اسی راستے سے گزرے گی۔

”آپ اتنی غیریت برت کر مجھے رنج پہنچا رہی ہیں۔ کیا ہمارے درمیان دوستی۔۔۔“

”ہمارے درمیان کوئی دوستی کا رشتہ نہیں ہے۔“ وہ اس کی بات قطع کر کے چیخی۔

”میرے خیال میں دشمنی کا رشتہ بھی نہیں ہے۔“ اُس کی دلکش مسکراہٹ بدستور گہری تھی۔

”دوستی یا دشمنی کا رشتہ کسی تعلق کی بنا پر بنتا ہے۔ ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میں تو تعلقات استوار کرنے کی ہر سعی کر کے شکست کھا چکا ہوں، اب تم ہی کوئی راہ بتاؤ۔“

”مفضل ہے ہر کوشش، ہر چال، ہر مکاری۔ یہ بات آپ اچھی طرح جان چکے ہیں کہ میں آپ کی ہوس کا شکار رہنے سے قبل موت کا شکار ہونا پسند کروں گی۔“ خضرئی کے سرد اور مضبوط لہجے پر اس کی مسکراہٹ یکدم ہی بجھ کر رہ گئی۔ آنکھوں میں عجیب سا حزن پھیلا چلا گیا۔ چہرے پر تاسف اور شرمندگی کے رنگ ابھرنے لگے تھے۔

”جو شخص اپنے خمیر کی سزا پہلے ہی بھگت رہا ہو، اسے مزید گھائل مت کرو خضرئی!“

”مگر آپ کا خمیر زندہ ہو گیا ہے تو یقیناً آپ کو اچھائی، برائی، نیکی اور بدی کا فرق بھی محسوس ہونے لگا ہوگا۔ اور اس وقت میری پوزیشن یہاں اس طرح کھڑے ہونے سے کس طرح متاثر ہو رہی ہے آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہوں گے۔ پلیز مجھے جانے دیں۔“

خضرئی کی حساس نگاہوں سے اُس کی بدلتی کیفیت جس میں غلامت، شرمندگی اور تاسف تھا، پوشیدہ نہ رہ سکی تھی۔ اُسے حیرانی تو ہوئی مگر یہ لہجہ تھا اس سے نجات حاصل کرنے کا۔

”مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز، میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میرے ساتھ چلی چلو۔ پلیز۔۔۔ پلیز ایسی کوئی بات نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔“ اُس کے چہرے پر پھیلنے لڑو کے سائے دیکھ کر وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”میں بہت مشکل میں ہوں۔ پلیز آپ میری مشکلات مزید نہ بڑھائیں۔ مجھے کوئی بات نہیں سننی۔“ وہ اُس کی کسی بات پر اب یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔

”صرف ایک بات۔ خدا گواہ ہے میری نیت میں کوئی کھوٹ یا بددیانتی نہیں ہے۔ میں صرف تم سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگنا چاہتا ہوں“ اُس کی نگاہوں میں ایک کرب آمیز ڈکھلکھورے لینے لگا۔ سرخ انگارہ آنکھوں میں ڈکھ بھرنے لگا تھا۔ ایک عالم کو اپنا تابع بنانے والا وہ خود سر، سنگدل، سرکش و ضدی شخص اس لمحے اس فقیر کی طرح کھڑا تھا گویا زندگی بھر اس کے مشکول میں کسی نے کوئی مکہ نہ ڈالا ہو۔ اپنی تمام اکڑ، برتری و مردانگی کا گھمنڈ بھول کر اس کے سامنے ایک ٹوٹے، بکھرے، شکست خوردہ شخص کی ایسی عاجزی و بے چارگی نے اسے اندر ہی اندر لرزایا ڈالا تھا۔ وہ کیا تھا اور کیا ہو گیا تھا۔

ناٹ فارسیل چیزوں کو خریدنے والے بندے کی حالت از حد دگرگوں تھی۔ وہ خاموشی سے کار میں فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے جھٹکس کہتے ہوئے کار اشارت کر دی۔ کار شفاف سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان خاموشی تھی۔

کہ میری وجہ سے کسی کو سزا کا مستحق ٹھہرایا جائے۔ جو کچھ ہوا میں بھول چکی ہوں اور آپ بھی بھول جائیں اور عہد کریں کہ آئندہ کسی مجبور کی مجبوری سے ہرگز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کریں گے۔“

شانزل کی آواز میں ایسا سوز اور ایسی تشنگی تھی کہ اسے یقین آ گیا جو وہ کہہ رہا ہے، وہ سچ ہے۔ وہ اپنے کئے پر نادم ہے۔ حقیقی معنوں میں شرمندہ ہے۔ کچھ دن کے اس کے ساتھ نے یہ تو اسے باور کروا ہی دیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے دونوں اور سچ بات ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی حالت اتنی ہی دگرگوں اور قابل رحم تھی۔

”اس کا مطلب ہے تم نے مجھے معاف کر دیا؟“ وہ پُر اشتیاق لہجے میں بولا۔

”میں نے کہا نا آپ اللہ سے معافی مانگیے، میں تو خود گناہگار بند کی ہوں۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بار کہو تم نے مجھے معاف کر دیا۔“

”آپ بے مقصد ضد کر رہے ہیں۔“ اس کے انتہائی انداز نے خضریٰ کو ہراساں کر ڈالا۔

”میں ضد نہیں کر رہا، درخواست کر رہا ہوں، التجا کر رہا ہوں، بلکہ بھیک مانگ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے آپ معاف کر دیں گی تو اللہ بھی مجھے معاف کر دے گا۔“ اس کا لہجہ بیگانہ ہوا تھا۔

”میں نے معاف کیا آپ کو۔ اللہ بھی آپ کو معاف کر دے۔“ خضریٰ نے آہستگی سے کہا۔

”تھینکس۔۔۔۔۔ تھینکس اے لوٹ خضریٰ۔“ اس کا لہجہ مسرت سے کانپ رہا تھا۔

”مجھے یہاں اتار دیں۔“ اس نے سامنے اسٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔

”اوکے۔ لیکن میری استدعا ہے تم سے اگر پوری کر دو تو مہربانی ہوگی۔ دراصل میں چاہتا ہوں تم مجھے کوئی مشورہ دو۔ ایسا مشورہ جو میرا لائف اسٹائل بدل کر دکھ دے۔ میں اس ماحول سے الگ ہو گیا ہوں۔ یہ سچ ہے تم سے ملنے سے تم میری زندگی مجھے کبھی کھوکھلی اور بے معنی نہیں لگتی تھی۔ لیکن اب دل چاہتا ہے کوئی ایسا ضرور ہے جسے دیکھ کر

”کیا تم مجھے معاف کر سکتی ہو؟“ وہ کچھ دیر بعد سنجیدہ بھاری آواز میں بولا۔

وہ قصد آخاموش رہی۔ شانزل کا رویہ اس کے لئے عجیب تھا۔

”جو کچھ میں نے کیا، اس کے لئے معافی، معذرت و شرمندگی بہت ہی چھوٹے لفظ ہیں اور شاید بے معنی و بے وقعت بھی۔ نذا گواہ ہے، میں سچے دل سے معذرت مانگ رہا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ جب سے گھر آیا ہوں میرا سکھ، چین، آرام و سکون سب کچھ مجھ سے روٹھ گیا ہے، کھو گیا ہے۔ نہ مجھے راتوں کو نیند آتی ہے اور نہ دن کو قرار۔۔۔۔۔“ وہ بولتے بولتے جیسے تھک گیا تو لمبے بھر کو خاموش ہو گیا۔ اس کا شخص تیز تھا اور خضریٰ نے محسوس کیا کہ اس تمام عرصے میں اسے مسلسل دھیمی کھانسی آتی رہی تھی۔

”ان دو ہفتوں کے عرصے میں نیند کو ترس گیا ہوں۔ سکون کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ بہترین ڈاکٹرز، اعلیٰ ترین میڈیسنز کوئی مجھے سکون نہ دے سکا۔ میرے اندر کوئی پکارتا ہے کہ میں نے خضریٰ حیات کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اسے بہت ذہنی تکلیف اور بے سکونی دی ہے۔ اور شاید مجھ سے ڈر کر خوف و فکر کے باعث تمہاری نیندیں بھی خراب ہوئی ہوں گی۔ ہر گھڑی بے سکونی و بے چینی کے کرب میں مبتلا رہی ہوگی۔ مجھے اپنے کئے کی سزائیں ہی ہے، مگنا فاسد عمل کا شکار ہو گیا ہوں میں اور اس عذاب سے نجات، اس سزا سے خلاصی مجھے تب ہی ملے گی جب تم مجھے معاف کر دو گی۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ تم نے درست کہا تھا کہ کچھ لوگ طاقت و دولت کے گھمنڈ میں خود کو بخیر رکھنے لگتے ہیں۔ اور کہتے حقیر و بے وقعت ہوتے ہیں جب ذرا سے جھکے سے عرش سے فرش کی خاک چاٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“

”آپ اللہ سے معافی مانگتے رہئے۔ رب سے توبہ کیجئے۔ ذہنی سکون و راحت سچی توبہ میں ہے۔ جب بندے اللہ سے ڈرنا چھوڑ دیتے ہیں، توبہ کی راہ نہیں لپاتے تو اسی طرح ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ اسی طرح سکون، راحت، چین اور مسرتوں کو ترستے ہیں۔ آج کل جہاں بھی نگاہ ڈالتے ہیں، مسلمانوں کو غیر مسلموں کے جبر و ظلم کا شکار دیکھتے ہیں، یہی وجہ ہے۔ میں بھی کوئی۔ بے گناہ اور اتنی اعلیٰ درجے کی مسلمان نہیں ہوں

”اوہ مائی گاڈ! کون ہے یہ حضری؟ کسی آسیب کی طرح میرے بچے سے چٹ مچی ہے۔ کچھ کرنا پڑے گا۔ ضرور کچھ کرنا ہوگا۔ میں اپنے بچے کو اس طرح چاہتے نہیں دیکھ سکتا۔ ان لڑکیوں سے معلوم کرنے کی کوشش کرو جو شانزل سے ملنے آتی ہیں۔“

”اب تو سوائے فضا بی بی کے اور کوئی نہیں آتی۔ صاحب نے سب سے ملنے سے منع کر دیا ہے، کسی سے نہیں ملے۔ صرف فضا بی بی اکثر چلی آتی ہیں اور وہ اس سے بھی نہیں ملے۔“

”شانزل کہاں ہے؟“ شاہ زہیب عارفین سے مخاطب ہوئے۔

”اپنے بیکروم میں سو رہے ہیں صاحب۔“

”اس وقت؟“ انہوں نے رست ولاق میں ٹائم دیکھا۔ ”معلوم بھی ہے لچ کا وقت ہو رہا ہے۔“

تار کی کتھی ہی دبیز کیوں نہ ہو مگر روشنی کی نغمی سی کرن اس کا وجود ختم کر ڈالتی ہے۔ اس نے شانزل خان کی نگاہوں میں ایسی ہی کرن دیکھی تھی۔ شاید کوئی لمحہ قبولیت کا اس کی زندگی میں در آیا تھا جو اس جیسے بدکردار اور آوارہ مزاج کو ہدایت و ایمان کی حیات افروز ضیاء بخش گیا تھا۔ آج اس بد دماغ اور سر پھرے شخص کا کیسا رویہ دیکھا تھا اس نے کہ ابھی تک اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ سچ شانزل خان ہی تھا۔

ہاں، وہ اتنا برا نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ خاصا وقت اس کی سنگت میں اس نے گزارا تھا۔ اگر وہ اتنا ہی گرا ہوا اور ادبائش فطرت ہوتا تو اپنی خواہش کی تکمیل کبھی بھی کر سکتا تھا۔ اور کیسے کیسے موتے نہ ملے تھے اُسے، اگر وہ چاہتا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ ضرور تھا کہ کئی مرتبہ ذومعنی جملوں سے اس نے اس کا خون ضرور خشک کیا تھا۔ کبھی نگاہوں کی بے باکیوں نے بلا ڈالا تھا۔ مگر یہ سب ایک حد تک تھا۔ اس کی عصمت کا تقدس اس نے ہر آن ٹھوٹ رکھا تھا۔ ایسے شخص کو وہ صدق دل سے معاف کر چکی تھی۔ اب اس کے من میں کوئی کدورت و نفرت نہ تھی۔ بلکہ طبیعت بہت فریش ہو گئی تھی۔ ایک خوف تھا جو ہر دم رہتا تھا، زائل ہو گیا تھا۔

زندگی، زندگی تھے۔“

”آپ شادی کر لیجئے، کسی ایسی لڑکی سے جو آپ کو بہت چاہتی ہو۔“ اس نے بہت خلوص سے مشورہ دیا اور ساتھ ہی اسٹاپ پر اتر گئی۔ پیچھے مڑ کر شانزل کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ وہاں اس وقت تک کھڑا رہا جب تک وہ کوچ میں چلی نہ گئی۔

”شانزل کہاں ہے؟“ شاہ زہیب عارفین سے مخاطب ہوئے۔

”اپنے بیکروم میں سو رہے ہیں صاحب۔“

”اس وقت؟“ انہوں نے رست ولاق میں ٹائم دیکھا۔ ”معلوم بھی ہے لچ کا وقت ہو رہا ہے۔“

”مجھ نے صاحب تاکید کر کے سوئے تھے کہ ان کو اٹھایا نہ جائے، وہ خود جاگ جائیں گے۔ بہت دنوں بعد ابھی خیند سونے جا رہے ہیں۔“ عارفین نے شانزل کے الفاظ دہرائے۔

”یہ معلوم کیا ہو گیا ہے اس لڑکے کو؟ میں بہت پریشان رہنے لگا ہوں۔“ وہ پریشان سے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کے پُر وقار چہرے پر اُداسی اور تپکر چھایا ہوا تھا۔

”مجھے لگتا ہے صاحب! یہ سارا معاملہ اس حضری نامی لڑکی سے تعلق ضرور رکھتا ہے۔ میں نے ہر ممکن کوشش کر لی یہ جاننے کی کہ حضری نامی لڑکی کہاں ہے مگر معلوم نہ کر سکا۔ لیکن یہ بات لازمی ہے کہ وہ لڑکی صاحب سے جیسی کرائی ہے جب وہ پچھلی بار کراچی سے باہر گئے تھے اور واپسی میں اس کا ہی کوئی روگ لگا کر لائے تھے۔“

”روگ؟ کیا بکواس کر رہے ہو۔“ شاہ زہیب سخت لہجے میں گویا ہوئے۔

”معافی چاہتا ہوں صاحب! مگر میں بالکل سچ بتا رہا ہوں۔ چھوٹے صاحب ان دنوں بہت زیادہ ڈر تک کرنے لگے ہیں اور سگریٹوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں اور مدہوشی کے عالم میں روتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں، معافیاں مانگتے ہیں حضری نامی لڑکی سے۔ اور بھی نہ معلوم کیا کیا کہتے ہیں۔“ عارفین نے دبے لہجے میں اطلاع دی۔

وہ جب سے آئی تھی شانزل خان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس لئے انابی کی خاموشی کی طرف توجہ نہ دے سکی۔ اب اپنی سوچوں سے چھٹکارا ملا تو ان کی خاموشی محسوس کی۔

”انابی! کیا بات ہے؟ آپ پریشان لگ رہی ہیں۔“ وہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔
”ملازمت چھوٹ گئی۔ وہ لوگ کل ملک سے باہر جا رہے ہیں۔“ وہ انفرنگی سے بولیں۔

”اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ اچھا ہوا خود ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔“
”بوش کے ناخن لونجی۔ مینے کا آخر چل رہا ہے۔ دو تا مراد، بد بخت کبھی بھی آدھکے
مجھ کہاں سے دیں گے اسے روپے؟ وہ تو اذیل ٹو بن کر بیٹھ جائے گا۔“
”آپ فکر مت کریں، کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“ اس بات کو وہ بھی سوچ رہی تھی مگر انابی کو تسلی دینے کی خاطر مسکرا کر بولی اور ابھی انابی بھی کوئی جواب نہ دے پائی تھیں کہ رافع فیاض دستک دے کر اندر چلا آیا۔

”ارے واہ! اب تو دروازہ کھلا رکھنے لگی ہوں۔ کیا چکر ہے؟“ وہ اندر آ کر خیانت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”چکر و کر کیا میاں! پڑوس سے بچہ آیا تھا وہی گیا ہے ابھی۔ ہم کنڈی چڑھانا بھول گئے۔“

”پڑوس سے بچے ہی آتے ہیں یا۔۔۔۔۔“

”نالتو بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شرافت سے بیٹھ جاؤ۔“

”خضرئی رانی! اب ممبر کا بیانہ لبریز ہو چکا ہے۔ بہت ممبر کر چکا۔ اب تو مجھے میرا روپیہ چاہئے۔ ابھی اسی وقت۔ کوئی بہانہ، کوئی جواز نہیں سنوں گا۔ اور کان کھول کر سن لو، میں کہیں جانے والا نہیں، سیکس ڈیرے ڈالے رکھوں گا۔“ وہ آرام سے نیم دراز ہو کر بولا۔

”ارے میاں! دماغ درست ہے تمہارا؟ جو منہ میں آتا ہے، بگ دیتے ہو۔“

”مجھے آنکھیں دکھانے کی ضرورت نہیں ہے بڑھیا! آج فیصلہ کر کے جاؤں گا۔ یا تو میری قرض کی رقم دو فوراً یا پھر۔۔۔۔۔ خضرئی کو لے کر جاؤں گا۔ ویسے بھی سال ہونے کو ہے۔“

”خضرئی کو بھول جاؤ میاں! روپیہ تمہیں دیں گے۔ کوئی بھانگے تھوڑی جا رہے ہیں ہم؟“ انابی غصے سے گویا ہوئیں جبکہ خضرئی کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔ انابی اور رافع فیاض کی خوب بحث ہو رہی تھی۔ وہ کسی طور پر واپس خالی ہاتھ جانے کو تیار نہ تھا جبکہ انابی اسے قائل کرنے کی سعی میں سرگرم عمل تھیں۔ مگر ان کے دلائل، ان کی یقین دہانیاں، ان کی مالی پوزیشن کی طرح خالی دکھائی تھیں۔ رافع کہاں بھل جاتا۔
”میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“ کافی دیر بعد جب ان دونوں کی بحث دیواروں سے باہر پرواز کرنے لگی تو وہ سپاٹ اور مضبوط لہجے میں بولی۔ وہ دونوں ایک دم خاموش ہو گئے۔

”جیت۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ جیت کبہ رہی ہو؟“ وہ حیرت و مسرت سے بولکھٹا اٹھا۔

”نہیں۔ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟“ انابی سخت لہجے میں گویا ہوئیں۔

”نہیں انابی۔ یہ سچ ہے۔ میں رافع فیاض کو اپنا شوہر قبول کر لوں گی۔“

بعد آؤں گا آپ کو ساتھ لے جانے کے لئے۔ تیار رہے گا۔“ وہ سرور سا جھوٹا چلا گیا اور انا بی غصے سے اٹھ کر اندر کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ خضریٰ کی جانب انہوں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔

نور محمد، مالک کے بلاوے پر فوراً ہی چلا آیا تھا اور ان کے سامنے اس کی ذرا جرات نہ ہوئی کہ کسی بات سے پہلو تہی کرتا کیونکہ ان کا لہجہ اور انداز اتنا سخت تھا کہ وہ ان کے ہر سوال کا جواب سچ سچ دیتا گیا جو وہ خضریٰ اور شانزل کے بارے میں جانتا تھا۔
”یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس لڑکی نے شانزل کی ذرا پرواہ نہیں کی اور شانزل اس کے پیچھے اس حد تک پہنچ گیا کہ آج خود سے بیگ نہ ہے اور وہ لڑکی ہر سو اس کو دکھائی دیتی ہے۔ سوتے، جاگتے، چلتے، پھرتے وہ اس کے تصور میں چھائی رہتی ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ لڑکی بے تصور ہے۔“ نور محمد کے سچ سچ بتا دینے کے باوجود انہیں یقین نہ آ رہا تھا۔ ان کی فراخ چیشانی پر سلوٹھیں تھیں اور آنکھوں میں بے یقینی اور الجھن۔

”اگر آپ اجازت دیں تو ایک عرض کروں صاحب جی؟“ نور محمد دھیسے لہجے میں بولا۔
”ہوں، کہو۔“ شاہ زیب صاحب نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے اجازت دی۔
”شاید منہ چھوٹا اور بات بڑی محسوس ہو آپ کو۔ مگر ہم وہی کہیں گے جو سچ ہے۔ کیونکہ یہاں سوال چھوٹے صاحب کی زندگی اور خضریٰ بی بی کی عزت کا ہے۔ صاحب کے پاس جتنی بھی لڑکیاں آتی تھیں، ان کا پک اینڈ ڈراپ میری ذیولٹی تھی اور صاحب! ان لڑکیوں اور خضریٰ بی بی میں وہ فرق تھا جو دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے میں ہوتا ہے۔ وہ بہت باحیا اور ٹیک لڑکی تھی۔ شرافت اور پاکیزگی ان کی بد وقار شخصیت سے جھلکتی ہے۔ وہ بہت بلند کردار اور اچھی لڑکی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غریب ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی اپنی خوبصورتی کی قیمت نہیں لگائی۔ چھوٹے صاحب نے بہت کوشش کی تھی انہیں ہر طریقے سے خریدنے کی مگر انہوں نے اپنی عزت اور خودداری کا سودا ہرگز نہیں کیا۔“

دافع فیاض جس سرگویا ہوا۔ ”شوہر تو میں تمہارا ہوں۔ بس تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث مبرا کر رہا تھا۔ اب اگر تم رادو راست پر آگئی ہو تو میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے۔“ از حد خوشی سے اس کی باجھیں کھلی ہوئی تھیں۔

”خضریٰ! کیا ہو گیا ہے جی، کیوں اول فول بک رہی ہو؟ یہ آدمی اس قابل نہیں ہے کہ اس سے کسی بھلائی کی توقع کی جاسکے۔ کیوں خود کو مصیبت میں ڈال رہی ہو؟“ انا بی اُس کی از حد تنبیہ کی و اضطراب کو دیکھ کر سخت متحش تھیں۔

”انا بی! جب مصیبتوں میں ہی زندگی بسر کرنی ہو تو پھر کسی ایک مصیبت کا انتخاب بہتر ہے، بلکہ دانش مندی ہے۔“ اُس کے سنجیدہ لہجے میں سکون سا دور آیا تھا۔

”ہے تو بہت نامنتقل نام، مگر تمہاری طرف سے ملا ہے تو دل و جان سے قبول ہے۔“ دافع فیاض خود کو ”مصیبت“ کا خطاب دینے پر خاصا سرور نظر آ رہا تھا۔

”بے غیرت و بے ضمیر لوگوں کی یہی نشانی ہے کہ گالی کو بھی اعزاز سمجھتے ہیں۔ اب یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔ کسی خوش فہمی کو دل میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی خضریٰ جی کا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔ جب ہوش میں آئے گی تو لاکھ بار لعنت بھیجے گی تم جیسے جوئے، مکار آدمی پر۔“ اس وقت دافع فیاض کا وجود انہیں ایک آنکھ نہ بھا رہا تھا سو خاصی بد لحاظی سے وہ اس سے مخاطب تھیں۔

”انا بی! پلیز غصے نہ ہوں۔ اور دافع فیاض، آپ دو دن بعد تشریف لائیے گا، تب تک میں انا بی کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔“ وہ قہراً مسکرا کر گویا ہوئی۔

”جو حکم سرکار آپ راضی ہو گئی ہیں، اب ہمیں کسی کے غصے کی پرواہ نہیں۔ دو دن

”کس نے کہا ڈیڈی! سکون دولت اور آسائش زندگی میں ہوتا ہے؟“
 ”کبھی غربت اور کسبہ کی زندگی دیکھی ہوئی تو یہ سوال کبھی نہ کرتے۔ کبھی وہ دور دیکھا ہوتا جہاں ترس ترس کر انسان صرف ایک وقت کی روٹی حاصل کرتا ہے۔ وہ بھی آدھا پیٹ تو محسوس ہوتا پیٹ بھر کر کھانے کا سکون کیا ہوتا ہے۔ جہاں ہمہ ساری زندگی محنت، کڑی مشقت میں گزار دیتا ہے اور عمر کے آخری ایام میں جب عمر کا تقاضا آرام و آسائش سے کچھ دن گزارنے کا ہوتا ہے اور پھر بھی نہیں گزار پاتا تو ان سے پوچھو کہ آسائش کیا معنی رکھتی ہیں۔“

”آپ ہر صحت مند ہوں ڈیڈی! مجھے صرف سکون کی تلاش ہے۔ مجھے نیند تو آتی ہے مگر سکون نہیں ملتا۔ میں نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی ہے مگر بے سکون ہوں۔ مجھے سکون کی تلاش ہے۔ میں سکون چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم مجھے کیا ہو گیا ہے؟ کاش آپ مجھے سکون کی بجائے کوئی مزدور بولتے، ہمیں بیٹ بھر کر روٹی نہ ملتی، زندگی کی گاڑی کو اپنے ہاتھوں سے دھکیلتا پڑتا۔ بے شک ہمارے لاکھوں دولت کے انباروں سے خالی ہوتے مگر سکون وطمینانیت کی دولت سے مالا مال ہوتے ہم۔ ڈیڈی! آج اس تکلیف دہ، بے سکون اور گناہوں بھری زندگی سے تو میں پاک ہوتا۔ جن پرندوں کو پرواز کی قوت نہیں ملتی یا جن کے پر آغاز پرواز سے قبل توڑ کر پھینک دیئے جائیں تو وہ کبھی بلندی کی طرف نہیں بڑھتے، ہمیشہ پستی میں گرے رہتے ہیں۔“

”شانزل! شانزل! تم ٹھیک نہیں ہو۔ ٹھیک نہیں ہو۔ میں ابھی ڈاکٹر محمد کو بلاتا ہوں۔ تم مجھے میٹھی ڈسٹرب لگ رہے ہو۔“ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”نہیں، میں ہوش میں تو اب آیا ہوں۔ پاگل تو پہلے تھا۔ آپ ڈاکٹر کو بلانے کی زحمت نہ کریں۔ میرا مرض لا علاج ہے۔“ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا تھا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک حقیر لڑکی کی خاطر تم اپنے علاوہ میرے خیال، میرے آسائش، میری پرستش سب کو انکار کر دو گے۔“ اس بار ان کے لہجہ میں خصلہ و خضر تھا۔ ”خضر ہی حقیر نہیں ہے ڈیڈی! وہی تو دولہ لڑکی ہے جس نے مجھے اس حقیقت سے

”اچھا ٹھیک ہے، جاؤ۔“ انہوں نے اسے جانے کا حکم دیا تو وہ سلام کر کے چلا گیا۔ وہ اٹھ کر شانزل کے بندروم میں چلے آئے جہاں وہ ارد گرد سے بے نیاز آنکھیں بند کئے کسی تصور میں غطاں تھا۔

”ہیلو مائی سن، یہ کیا حالت بنا لی ہے؟“ بڑھا ہوا شیو، بکھرے بال، تلخ لبا لاس اور بیمار زرد چہرہ۔ جوان اور وجہ بیٹے کی حالت نے انہیں لرزادیا تھا۔ وہ کس راو پر چل پڑا تھا۔

”اوہ..... ڈیڈی! سو..... سو..... میں..... م.....“ باپ کو سامنے دیکھ کر وہ یوں کلا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”کیا ہے یہ سب؟ نہ آفس آر ہے ہو اور نہ کسی سے ملنے، بات کرتے ہو۔ یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ کیوں مجھے پریشانوں کے مخرامے میں جھکا رہے ہو بیٹے؟“

”آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں ڈیڈی۔ مت خود کو ڈپریشنڈ کریں۔“

”یہ مجھ سے کہہ رہے ہو؟ باپ سے؟ میری ساری زندگی تمہاری فکر، تمہاری محبت میں گزری ہے۔ میری امیدوں اور خواہشوں کا آخری مرکز تم ہی ہو مائی سن۔ پھر کس طرح میں پریشان نہ ہوں؟ واپس لوٹ چلو اپنی دنیا میں میری جان۔ تمہیں کس چیز کی کمی ہے؟ کیا شے تمہیں میسر نہیں ہے؟ جب بھی تم نے کوئی فرمائش کی، میں نے ڈھیر لگا دیا ہے تمہارے سامنے۔ ہر وہ کچھ خرید کر دیا ہے جس کی تم نے چاہ کی ہے۔ پھر اب یہ سب کیا ہے؟“

”آپ نے مجھے سب کچھ دیا ہے، ہر فرمائش پوری کی ہے ڈیڈی! آخری فرمائش بھی پوری کر دیجئے۔ مجھے سکون خرید کر لا دیجئے۔ بس اس کے بعد کوئی فرمائش نہیں کروں گا آپ سے۔“

”شانزل! کیا ہوا ہے؟ کیوں سکون کے متلاشی ہو؟ ایک پُر آسائش لائف گزارنے کے باوجود تم بے سکون ہو؟“ انہوں نے تعجب و تکلیف سے جوان بیٹے کی سمت دیکھا جو بھری بہار میں خزاں رسیدہ درخت کی مانند نظر آ رہا تھا۔

روشناس کرایا کہ میں کل تک اندھیروں کو اچالے سمجھ کر جی رہا تھا۔

”وہ بے وقعت اور غریب لڑکی جو کل تک ہماری فرم میں چند ہزار کی ملازمہ تھی، آج تمہارے لئے سب کچھ ہو گئی۔ ہاپ سے بھی زیادہ اہم؟ کتنی ہائی کلاس، ہائی اسٹیٹرز کی لڑکیوں سے تم ملے، ان سے دوستی کی، ان کے ساتھ وقت گزارا اور پسند بھی کیا تو ایک ایسی لڑکی کو جو نہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور نہ اچھے خاندان سے۔“

”عورت کی حیا اور پاکبازی ہی اس کا ہائی اسٹیٹرز ہوتا ہے۔ اور جن ہائی کلاس سو کر کے والی لڑکیوں کی بات آپ کر رہے ہیں، بخوبی جانتے ہیں ان کے پاس کیا ہوتا ہے۔“

”میں تمہارا دشمن نہیں بننا۔“ اُسے باغی ہوتے دیکھ کر وہ نرم روی سے گویا ہوئے۔

”اگر آپ میرے دشمن نہیں ہیں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے اور کبھی بھی خضریٰ کے متعلق ایسے لفظ استعمال مت کیجئے گا جو مجھے تکلیف پہنچائیں۔“ جیسی جیسی چلنے والی کھانسی اب شدت سے چلنے لگی تھی۔

”یہ دوستی اور میرے رہنے کا تقاضا نہیں ہے کہ میں تمہیں اس حال میں تنہا چھوڑ دوں۔ اگر تمہیں وہ لڑکی اتنی ہی عزیز اور پسند ہے تو میں اسے اپنی بہو بنانے کو تیار ہوں۔ مجھے لوگوں کی کبھی بھی پروا نہیں رہی۔ مجھے صرف اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی عزیز ہے۔“ اس کی از حد محبت اور دیگرگوں حالت نے بہت جلد انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ ویسے بھی وہ عام دولت مندوں کی طرح مغرور اور خود پسند نہیں تھے۔

”یہ ممکن ہی نہیں ہے ڈیڑی۔“ وہ پُرسوز مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولا۔

”کیا مطلب؟“

”وہ شادی شدہ ہے۔ اور شاید اپنے ہسٹنڈ سے بہت محبت کرتی ہے۔“

”شادی شدہ ہے؟ پھر تمہاری یہ بے قراری، وحشت، جنون خیزی و اضطراب کیا سستی رکھتا ہے؟ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ وہ ایک شادی شدہ لڑکی ہے، تم نے اس سے محبت کیا؟“ وہ سخت حیران و پریشان تھے۔

”محبت؟ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ جبکہ یہ میں خود نہیں جانتا کہ مجھے اس سے محبت ہے، عقیدت ہے یا۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔“ اُس نے بالوں میں اضطرابی انداز میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”میرے خیال میں تم شادی کرنے پر راضی ہو جاؤ۔ جب انسان کو سچے چاہئے والے کی محبت ملتی ہے تو وہ سب بھول جاتا ہے۔“

”ہاں، میں نے بھی یہی کہا تھا۔ میں شادی کروں گا ڈیڑی۔ مجھے سکون چاہئے، آرام چاہئے۔ ایسی نیند چاہئے جس سے بیدار ہوں تو تازگی اور راحت کا احساس ہو۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں گویا ہوا تو شاہ زیب پُرسوز نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھتے رہ گئے۔ شادی کے نام سے بھی نفرت کرنے والا بندہ آج خود اقرار کر رہا تھا۔

”آپ نے کھانا پینا، مجھ سے باتیں کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے انا بی؟ کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی اذیت دے رہی ہیں۔ رافع فیاض کے ساتھ رہنے کا فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش تو کریں۔“ وہ خاموشی اور ناراض بیٹھی انا بی کے قریب بیٹھ کر التجا نہ لہجے میں گویا ہوئی۔

”اب تم بہت عقل مند اور خود مختار ہو گئی ہو، بھلا میرے سوچنے سے کیا ہوگا؟“

”جیسن، ایسا نہیں ہے انا بی۔ آپ مجھے دل و جان سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ بچے بڑھے بھی ہو جائیں تو اپنے بزرگوں کے لئے بچے ہی رہتے ہیں، نا سمجھ اور کم عقل۔ مگر انا بی اب کبھی کبھی ایسا بھی دور آتا ہے بلکہ وقت آتا ہے کہ چھوٹوں کو اپنی بالشت بھر عقل سے ہی بڑے بڑے فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں بے چارگی و رانگی تو انہیں اس پر ترس آ گیا۔

”میری بچی! میں کہتی ہوں اتنی جلدی اپنے رب سے مایوس نہیں ہو جاتے۔ وہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔ جلد ہمیں اس آزمائش کی گھڑی سے نکال لے گا۔ کیوں ساری زندگی کے لئے اس منہوس، دغا باز کا ساتھ قبول کر رہی ہو؟ اُس ذلیل شخص نے اول روز سے

جھوٹ درجھوٹ بولے۔ تمہاری مرحومہ ماں پر تہمت رکھی کہ شادی کے لئے اس نے قرضہ لیا اور پھر ہر ماہ روپے لینے کے باوجود جھوٹ بولتا رہا کہ اس کے پاس کم سے کم رقم بچتی ہے۔ جو آدمی اپنی زبان کا پکا نہ ہو، اس سے آگے کیا امید رکھی جائے؟ جو لوگ سچے اور مخلص نہیں ہوتے، وہ کبھی بھی قابل اعتبار اور قابل مہروں نہیں ہوتے۔ انہوں نے پیار سے اُسے سمجھانے کی سعی کی مگر سمجھتے وہ ہیں جو سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی پریشان کن زندگی سے اس حد تک بددل ہو گئی تھی کہ اب اس شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا تجربہ کر چکی تھی جو کسی بھی اعتبار سے اس کے قابل نہ تھا۔

”جو اُس نے کیا، وہ خود بھگتے گا۔ کم از کم مجھے کمزور کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہم دونوں بغیر کسی سرو کے سہارے اس معاشرے کے گدے نما مردوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قدم قدم پر ایسے لوگ ہماری راہ پر اپنی ناپاک آنکھیں کولے بیٹھے ہوتے ہیں۔“

”اور رخسانہ کا کیا ہو گا؟ وہ تمہیں تنگ دے گی؟ جس عورت نے پہلی رات ہی تم سے سارا زبور لے کر، تمام سامان پر قبضہ جما کر خالی ہاتھ رات کی تاریکی میں تمہیں گھر سے نکال دیا تھا اب وہ، اس کے منہ سے بھائی اور چندال ماں تمہیں رہنے دیں گے؟“

”نہانی اچھے ڈر کی نہیں، دعاؤں کی ضرورت ہے۔ مجھے دعا دیں۔ کہیں تو میں سرخرو ہو جاؤں، کوئی گوشہ عافیت میرے لئے بھی ہو جہاں چند دن زندگی کے سکون سے گزار جائیں۔“

اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔ مخصوص دستک سن کر خضرئی، انابی سے التجائیہ لہجے میں بولی۔

”پلیز انابی! رافح فیاض سے آرام سے بات کیجئے گا۔ اور آپ بھی ہمارے ساتھ چلنے کی تیاری کر لیں۔“

”نہیں بی، مجھے معاف کرو۔ خادع تمہارا ہے۔ تم ہی اس کے ساتھ جاؤ۔ میں یہاں رہ کر تمہارے لئے خوشیوں کی دعا کروں گی۔“ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

”شانی ڈارنگ! بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟ یہ پراسرار خاموشی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔“ فتنہ نے اداسے دلربائی سے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر لاڈ بھرے لہجے میں کہا۔ وہ اس وقت سمندر کی ٹھنڈی ریت پر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ آتی جاتی لہریں ان کے قدموں کو چھو کر گزر رہی تھیں۔ موسم ابراہیم تھا، ماحول پر ایک دلکش سحر چھایا ہوا تھا۔

فتنہ پر اس موسم کا پورا پورا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ ویسے بھی شانزل کو اس نے بہت عرصے بعد اپنی طرف لوٹتے دیکھا تو مسرت و شادمانی سے بے خودی ہو رہی تھی۔

گو کہ وہ پہلے کی طرح شوخ، بے باک اور بے قرار نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہت بدل گیا تھا۔ جو نکاہیں پہلے بے باکی سے اس کی جانب اٹھتی تھیں، اب تو جیسے وہ اس کی جانب اٹھنا ہی بھول گئی تھیں۔ عجیب کھویا کھویا، بیگانہ انداز تھا اس کا۔ اب بھی وہ اسے ساتھ لے کر یہاں آیا تھا کہ کوئی ضروری بات کرنی تھی۔ مگر پچھلے ایک گھنٹے سے وہ خلاؤں میں نہ معلوم کیا کھوج رہا تھا کہ اس کی نگاہیں ارد گرد سے بے نیاز خلاؤں میں گم تھیں۔ چہرے پر اندھ بنجیدگی طاری تھی۔ اس کی خاموشی کو دیکھ کر بالآخر فتنہ کو بولنا پڑا۔

”بولو بی؟“ شانزل سرخ انکار و نگاہیں اُس کے خوبصورت چہرے پر ڈال کر بولا۔

”نہیں۔ دل و جان سے چاہتی ہوں تمہیں۔“ وہ خوشی سے گھٹنا ہو کر بولی۔

”کتنی چاہتی ہو مجھے؟“ لفظ رومانوی مگر لہجہ سچا اور احساسات سے عاری تھا۔

”کتنی جتنا کسی نے کسی کو بھی نہ چاہا ہو۔ تم میری روح میں بسے ہو شانی۔ میں پہلے دن سے تمہیں چاہتی آ رہی ہوں۔ مجھے یقین تھا میری چاہت ایک دن ضرور خود کو منوائے گی اور وہ خوش نصیب دن آج آ گیا۔ تمہیں احساس ہو گیا میری محبت کا؟“ وہ جذباتی لہجے میں کہتی ہوئی اس کے شانے سے لگ گئی۔

”چلیں۔“

”کہاں؟“

”گورٹ۔“

”کیوں؟“

”میرج کرنے۔“

”نو..... یو آر جرنل؟“ اس کے چہرے کی پتھریلی سنجیدگی اور لہجے کے ٹھوس پن نے اسے حیرانی و پریشانی میں مبتلا کر ڈالا تھا۔ وہ حیرت سے بولی۔

”شادی مذاق تو نہیں ہوتی۔ دورشتوں کا بندھن، دونوں کا ملن کس طرح غیر سنجیدہ بات ہو سکتی ہے ڈیڑا میں سیریس ہوں۔“ اس کی سنجیدگی ہنوز برقرار تھی۔

”مگر کیوں؟..... کیا انکل راضی نہیں ہیں؟“

”نہیں۔“ اس نے اطمینان سے انکار کیا۔

”پھر ہم کورٹ میرج کیوں کریں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟“

”مجھے سکون کی تلاش ہے۔ اور سنا ہے سکون اور سچی راحت سچے رفیق حیات کے وجود سے ملتی ہے۔ سو مجھے دنیا داری اور دکھاوے کی ضرورت نہیں ہے، صرف ایسے ساتھی کی تلاش ہے جو سکون و راحت دے۔ ظاہری نمود و نمائش بے جا دولت کا اصراف ہے جو کبھی بھی حقیقی مسرت نہیں دیتا قلب کو۔ مجھے تسکین چاہیے، ذہنی، روحانی و قلبی۔“ اس نے کھوئے کھوئے کرب آمیز لہجے میں کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا، ایسا کس طرح ممکن ہے کہ اس ملک کے ہائی اسٹینڈرڈ سے.....“

”تمہیں مجھ سے محبت ہے کہ میرے ڈیڈی کے اسٹینڈرڈ سے؟“ اس کی بات قطع کر کے وہ غصے سے گویا ہوا۔

”شازل! جو بات تمہیں سوچنی چاہئے تھی، وہ میں سوچ رہی ہوں۔ تم اپنے ڈیڈی کے اٹکوتے بیٹے ہو، ان کی تمام جائیداد کے.....“

”سودی، میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ میں اب ڈیڈی کی دولت و جائیداد سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ خود محنت مزدوری کروں گا۔ اس دولت و جائیداد نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میرا سکون، چین، کردار، وقار و شرافت سب داغدار کر دی۔“

”لوہ شانی! مجھے لگتا ہے تم سیکلی ڈسٹرب ہو۔ شاید بہت زیادہ ڈرنک کرنے لگے ہو جیسی اتنی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔“ فضا رنگ بدلتے چہرے سے اس کی جانب دیکھتی ہوئی حیرانی و غرور مندی سے گویا ہوئی۔

”درست ہے میرا دماغ، ہوش و حواس قائم ہیں میرے۔ مجھے یہ بتاؤ بغیر دولت و جائیداد کے تم مجھے چاہو گی یا نہیں؟ ایک بے حیثیت و غریب انسان سے شادی کرو گی؟“ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مضبوط لہجے میں بولا۔ فضا نے ایک بار پھر اس کی جانب دیکھا کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہو، اس کا امتحان لے رہا ہو۔ مگر اس کی سرخ نگاہوں اور وسیعہ چہرے کے نقوش سے چائی اور سنجیدگی جھلک رہی تھی۔ وہ اسے کچھ عرصے قبل سے جانتی تھی اور اس تھوڑے عرصے میں ہی سمجھ چکی تھی کہ وہ قول کا پکا تھا، جو کہتا وہی کرتا تھا اور اب بھی وہ جو کہہ رہا تھا، وہ بھی سچ تھا۔ بھلا اس جیسے سر پھرے اور مندی شخص کا کیا بھروسہ کہ کب کیا ضد ذہن پر سوار ہو جائے اور اس کی جستجو میں ٹھوہو جائے۔

”مجھے جلد جواب دو۔ وقت نہیں ہے میرے پاس۔“ وہ بے قراری سے بولا۔ اس وقت بھی وہ بڑی کشش کا شکار تھا۔ فضا کا جواب ہی اس کی محبت کی کسوٹی پر پرکھا جانا تھا۔

”میرے خیال میں تم اچھا نہیں کر رہے۔ ہمیں اس طرح شادی نہیں کرنی چاہئے۔“

”کیوں؟“ اس مرتبہ اس کے لہجے میں سرد مہری و بیزاری نمودار آئی تھی۔

”کسی غریب کی اولاد، دولت و جائیداد پا کر خوشحال و پرسکون زندگی تو گزار سکتے ہیں مگر ایک ایسا شخص جس نے آنکھ کھولتے ہی دنیا کی ہر اس شے کو اپنی دھڑ میں پایا ہو جو عام تو درکنار خاص لوگ بھی جن کی گردنیں پاتے بھلا ایک ایسا شخص کس طرح غربت و لاچارگی کی زندگی گزار سکتا ہے۔ ناممکن ڈیڑا۔“

”ممکن ہے فضا۔ سچی محبت کی خاطر تو لوگ حراؤں، جنگلوں، ویرانوں میں مسکن بنا لیتے ہیں۔ اگر تمہیں میرے سہارے کی ضرورت ہے تو میری محبت کی خاطر قربانی دینی پڑے گی۔“

”قربانی؟ محبت؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم کیا بات کر رہے ہو؟“ وہ تیز ہوا سے

باعث نقصان و نقصان کے نمودے کرتا ہے۔ تا سمجھ بھول جاتا ہے کہ اس کی رشتی صرف مخصوص حد تک ہی وراثت کی جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا میں بیٹھا ہے۔ ہر شے کا مالک، ہر سمت پر اختیار رکھنے والا۔

ہر ذی روح پر قادر۔

یہ خوبیاں صرف ایک ذات کی شان ہیں۔

جو واحد لا شریک ہے، زمین و آسمان کا مالک ہے، تمام مخلوق کا مالک ہے۔ اللہ اپنے بندے کا ضبط اس کا ظرف، اس کا حوصلہ اس کا ایمان آزمانے کے لئے کچھ عرصے چھوٹ دے دیتا ہے اور بندہ سمجھتا ہے اس کی کبھی پکڑ نہیں ہوگی۔ اس کی رشتی کبھی سمجھتی نہیں جائے گی۔ کبھی وہ اپنے رب کے سامنے اپنے اعمال لے کر حاضر نہیں ہوگا۔ کبھی اندھیری قبر کی آغوش میں نہیں سائے گا۔

آہ..... ایسے شیطانی دھوکے میں بہت سے دین و ایمان سے بے گانہ ہو کر آخرت کے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں اور ساتھ کیا ہوتا ہے؟ ہماری زندگی غفلت میں گزاری، عمر کے گناہ، جھوٹ، فریب، ایہوں سے کی گئی حق تلفیوں کے انبار۔

”چھوڑیں انانی! چلا گیا وہ..... اب تو اس کو اچھے نام سے یاد کیجئے۔“ حضرت نے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بتاتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

”ہاں۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ جتنے دکھ اور تکلیفیں اس نے ہمیں دیں، وہ ہم نے معاف کر دیں۔ اللہ بھی اسے معاف کرے۔“ وہ طویل سانس لے کر گویا ہو گئیں۔

رائع قیاض اس دن حضرت کو گھر لے جانے کا کہہ کر گیا تو راستے میں سڑک پر ٹرک کی زد میں آ کر ہلاک ہو گیا تھا۔ ان تک یہ خبر اخبار کے ذریعے پہنچی تھی، جس میں اس کی تصویر بھی تھی۔ کچھ لمحے تو اسے اپنے اعصاب منجمد ہوتے محسوس ہوئے، تقدیر کی کیسی ستم ظریفی تھی یہ..... جب وہ اس سے بچھکارا پاتا چاہتی تھی تو کامیابی نہ ہوتی تھی اور اب جب وہ اسے دل و جان سے قبول کرنے کو تیار تھی تو وہ ہمیشہ کے لئے اسے چھوڑ کر اس دنیا سے ہی چلا گیا تھا۔

اڑتے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹتے ہوئے پریشان انداز میں بولی۔

”میں بہت سیدھی اور صاف بات کہہ رہا ہوں۔ اگر تمہیں مجھ سے کچی محبت ہے، تم میری زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہو تو تمہیں یہ پُر آسائش زندگی چھوڑنی ہوگی۔“

”تمہیں کیا ہو گیا ہے شانی؟ دولت کے بغیر زندگی کس طرح گزاری جاسکتی ہے؟“

”اس کا مطلب ہے تمہیں مجھ سے نہیں میرے بینک بیلنس، میرے ایشیئس سے محبت ہے؟“

”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ بغیر محبت کے زندگی گزاری جاسکتی ہے مگر بغیر دولت کے نہیں۔ اور جس ہائی کلاس میں ہم مودو کرتے ہیں وہاں تو.....“

”اسٹاپ اٹ۔ مجھے اب کوئی فضول بکواس نہیں سنی۔ چلو میں تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کر دوں۔ اور ہاں، یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہمارے درمیان اب کوئی رشتہ نہیں ہے میں کوئی وضاحت، کوئی دلیل نہیں سنوں گا۔ میرا آئیڈیل سٹی سوچ رکھنے والی لڑکی ہرگز نہیں ہے۔ جو محبت کرتے ہیں وہ صرف محبوب سے تعلق رکھتے ہیں۔ محبوب کا ساتھ ہی ان کا زادراہ بن جاتا ہے، جو محبت نہیں کرتے وہ زندہ نہیں ہوتے۔“

اپنی صفائی میں کچھ کچی فتنہ کو وہ خاموش رہنے کا اشارہ کر کے بہت جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ فتنہ کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ آتے ہوئے وہ جس آرزو خوش اور پُر جوش تھی، واپسی کا سفر میں بہت ہی خاموش و تنگ دکھائی دے رہی تھی۔

بہت خوش نصیبی تھی اس جیسے خوب رو، اسارٹ اور ہر لحاظ پر بندے کو پاتا۔ مگر بغیر دولت و جائیداد کے وہ ایسا ہی تھا جیسے گولڈن رنگ ڈائمنڈ سے خالی ہو۔ اور وہ تو اپنی فیملی کی حسب خواہش ڈیڈ کے ڈاؤن ہوتے بزنس کو سہارا دینے کی خاطر اس کی جانب پر جی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ شانز دل و جان سے مرثی تھی مگر اتنی شدید محبت میں مبتلا نہ ہوتی تھی کہ خالی خولی شانز دل کا ساتھ قبول کر کے سمپری کی زندگی گزارتی۔

”وہ انسان ہی بہت تکلیف و نقصان میں ہے جو اپنی ہوس زور اور حرص طبیعت کے

محبت میں انہوں نے اپنی خواہشات و امیگوں اور فوجانی کے تقاضوں کو تہہ باری مہاکے ساتھ ہی دفن کر دیا اور تم پر ان کی دنیا ختم ہو گئی۔ ذرا سوچو، دیکھو اپنے اطراف میں۔ کون ایسا باپ ہے جو صرف ایک بیٹے کی خاطر اپنی خوشیوں اور جذبات کا گھٹا گھونٹ دیتا ہے جبکہ وہ صاحب حیثیت بھی ہو اور جوان اور سارٹ بھی۔ ہمارے معاشرے میں تو مل کلاس کے لوگ جو پانچ چھ بچوں کے باپ ہوتے ہیں، کئی بہانے کر کے چھ ماہ میں ہی مگر بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی جوانی و ازدواجی زندگی کی کئی بہاریں گزاری چکے ہوتے ہیں، مگر میری جان! ہر باپ کی محبت نفس پر غالب نہیں آسکتی۔ بے چارے انکل نے ایک ہی سال تو ازدواجی زندگی کا گزرا دیا تھا۔ بچپن سے بڑی مشقت، محنت اور لگن و جانفشانی سے ایک ننھے سے پودے کی آبیاری کی تھی۔ اسے وقت کے سرد، گرم و آندھی، طوفان سے بچا کر رکھا تھا۔ اس درخت کے پھل دینے کا وقت آیا، اس کی ٹھنڈی اور ٹھنکی چھاؤں میں کچھ سستانے کا وقت آیا تو وہ سب محنت و مشقت فراموش کئے زمین بوس ہونے کو تیار تھا۔ بہاروں کی آمد سے قبل ہی خزاؤں کا شکار بن بیٹھا تھا۔ خود کو سنبھالو شانزل، خود کو سنبھالو۔ تم اپنی چند روزہ محبت کے سوگ میں باپ کی برسوں کی محبت کو بھلا بیٹھے ہو۔ کس قدر خود غرض و خود پرست ہو تم۔“

”یہ کس نے کہا کہ میں ڈیلری سے محبت نہیں کرتا؟“ وہ سیدھا ہو کر چونک کر بولا۔

”تمہاری ان حرکتوں نے، اس گوشہ نشینی اور دنیا سے بیزاری نے۔ جب تم خطرئی کو پکارتے ہو اس کے بنا کر جانے اور اس کی محبت کے بغیر زندہ نہ رہنے کی جب تم قسمیں کھاتے ہو تو شاید تم سوچ بھی نہیں سکتے جو ان، اکلوتے، لاڈلے بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر وہ کتنے اپ سیٹ ہوتے ہیں۔ تمہاری فکر، تمہاری وجہ سے ان کا برفس ہی نہیں بلکہ دل و دماغ دونوں ہی طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ آخر تم کب خود فراموشی سے باہر نکلو گے؟“

شہریار جو کل شاہ زیب کے منہ سے یہ سب باتیں سن چکا تھا، اس نے پہلی بار بہت پروقار و بازعب شخصیت رکھنے والے شاہ زیب کو جب بیٹے کی محبت میں روتے دیکھا تو بری طرح تڑپ اٹھا تھا۔ انہوں نے خصوصی طور پر اسے پاکستان بلوایا تھا کہ وہ شانزل کا

بلوایا خود کا شہر بنانا ہے۔ کیا تم نے وہ سب نہیں چاہا تھا جو میں کہہ رہا ہوں؟“

”میں جب اندھیرے کا مسافر تھا، شہری! بے تحاشا دولت اور بے جا اختیارات کا نشہ جب حد سے سوا ہو چکا تھا، دنیا مجھے اپنی مٹھی میں بند محسوس ہوتی تھی۔“

”اب کیا ہوا؟ دولت، اختیارات، وجاہت، خوبروی تمہارے پاس ہی موجود ہیں۔“

”کیوں اتنے بیزار اور بدگمان رہنے لگے ہو؟“

”اب میں روشنی میں آ گیا ہوں۔ ضمیر کی عدالت میں کڑی سزا پارہا ہوں اور میری مٹھی میں ندامت، پچھتاوے اور فحالت بند ہے۔ مجھے بے سکونی کی سزا دی گئی ہے اور مجھ سے پوچھو کہ اس سے بڑی سزا کوئی نہیں ہے۔ سکون سے بڑی راحت کوئی نہیں ہے۔ میری دولت، میرے اختیارات، میری وجاہت، میری خوبروی کوئی میرے کام نہیں آئی۔ یہ سب دے کر بھی میں سکون حاصل نہیں کر سکوں گا۔“ اس نے بے کل لہجے میں کہا تو آگے بڑھ کر شہر یاد نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”تمہیں انکل کا خیال کیوں نہیں آتا؟ ان کی سالوں کی پرورش، محبت اور پیار پر یہ چند روزہ محبت اتنی حاوی ہو گئی کہ تم ان کی محبت اور ان کی پریشانی کو بالکل فراموش کر بیٹھے۔ وہ باپ ہیں مگر ایک قابل فخر اور قابل تحسین باپ جو بچپن سے آج تک صرف تمہاری محبت میں شریک رہے۔ دیکھو شانزل! باپ سب اپنی اولادوں کو چاہتے ہیں اور پیار کرتے ہیں مگر ایسے وقت میں جب سب کچھ اختیارات رکھتے تھے، تمہیں معلوم ہے نا تمہاری مہارتی پیدائش والے دن ہی فوت ہو گئی تھیں اس وقت بھی انکل کے پاس دولت و جائیداد کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اگر وہ چاہتے تو آسانی سے دوسری شادی کر سکتے تھے۔ تمہاری دوسری ماں لا سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ صرف تمہیں سوتیلی ماں سے بچانے کی خاطر انہوں نے شادی نہیں کی۔ حالانکہ کئی لوگوں نے اپنی بیٹیاں اس شرط پر دینے کی کوششیں کیں کہ وہ تمہیں سبکی ماں سے بڑھ کر پیار دیں گی، تمہاری پرورش کریں گی مگر انکل کسی طور یہ بات ماننے کو تیار نہ تھے کہ کوئی بھی لڑکی ان کے بیٹے کی دوسری ماں بن کر آئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم پر مٹنی اثر ڈالے۔ تمہاری

واحد دوست تھا۔ ان کی بے غرض اور سچی محبت پر اسے بہت رشک آیا، جب وہ بولے۔
 ”بیٹا شہریار! اگر وہ لڑکی شانی کی زندگی میں چکی ہے تو اس کی خوشی کی خاطر میں سب
 کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر وہ لڑکی اپنے خاوند سے طلاق لے کر شانی کے نکاح میں آتا
 چاہے تو بخوشی اُسے بہو ماننے کو تیار ہوں، بشرطیکہ وہ لڑکی اپنی رضا و رغبت سے طلاق
 لے کر شانی کے نکاح میں آئے۔ زبردست ہرگز نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ زبردستی کے
 بندھن کبھی پائیدار نہیں ہوتے۔“

یہ رضامندی ان کی اس محبت کا ثبوت تھی جو وہ اس سے کرتے تھے۔ ورنہ عموماً اعلیٰ
 کنبہ کی عورتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی سوچ اور طرز عمل بالکل متضاد ہوتا ہے۔ جیسی اس
 نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شانزل کو راز راست پر لائے گا۔

”کیا میں ڈیڈی کو بہت تنگ کرنے لگا ہوں؟ میری وجہ سے پریشان ہیں؟“ وہ گویا
 خود سے مخاطب تھا۔

”شکر کرو میری جان، وہ تمہارے ڈیڈی ہیں جو تمہیں کچھ کہنے کی بجائے اس کی فکر
 میں لگ گئے ہیں کہ کسی طرح پیارے، لاڈلے، دلارے بیٹے کی خواہش پوری ہو
 جائے۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا اور انکل کی جگہ والد صاحب تو یقیناً رکواب تک مجھے وہ
 قبر میں اتار کر قلعہ پاک کر چکے ہوتے کہ کنجش نے لڑکی پسند بھی کی تو وہ جو پہلے سے
 شوہر کو پیاری ہو چکی ہے۔“ شہریار اپنے والد کے لہجے کی نقل اتار کر بولا۔

”تم یار بار خضرئی کا ذکر اس انداز میں کر کے اُس کی توہین کر رہے ہو، جو میں کسی
 طور برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے جس انداز میں تم اس کا ذکر کر رہے ہو۔
 وہ بہت شریف و باحیا لڑکی ہے۔ اگر اب تم نے اس کا نام لیا تو میں کوئی لحاظ و مروت
 نہیں کروں گا۔“ اُس نے غصے سے کہا اور ہاتھ روم میں جا کر زور سے دروازہ بند کیا۔
 شہریار نے بے ساختہ کانوں میں انگلیاں دے ڈالیں۔

موسم صبح سے ابر آلود تھا۔ جب وہ اپنی ساتھی منچر کے ساتھ اسکول آف ہونے کے

بعد گیٹ سے باہر نکلی تو ہلکی ہلکی پھوار مگرنی شروع ہو گئی تھی۔

”واصفہ! شاپنگ کل کر لیں گے اگر موسم درست رہا تو۔“ اُس نے اپنے گرد چادر
 درست کرتے ہوئے کہا۔ واصفہ نے ایک نگاہ اوپر آسمان پر ڈالی پھر ہنس کر بولی۔

”گھبراؤ نہیں مائی ڈیئر! ہم کراچی والے اتنے خوش نصیب نہیں ہیں کہ بھرپور بارش
 کا مزہ لوٹ سکیں۔ یہاں تو بس یہ ہلکی پھلکی پھوار اور بوند باندی آتش شوق بڑھا کر چلی
 جاتی ہے۔ ہمارے نصیبوں کے بادل تو دوسرے شہروں میں موسلا دھار برستے ہیں۔“

”پھر بھی احتیاط لازم ہے۔ کیا معلوم آج یہ ہماری حسرتیں دھو ڈالے۔“
 ”جب ہوگی، جب دیکھی جانے کی۔ نی الحال شاپنگ کو چلنا ہے تو بس چلنا ہے۔ مجھ
 سے انتظار نہیں ہوتا۔ اور پرسوں میرے منگیتر کی برتھ ڈے ہے۔ کم از کم ایک دن پہلے تو
 اس کے لئے گفت خریدنا اس کا حق بنتا ہے نا؟ چلو، میں ناں نہیں سنوں گی۔“ قریب
 سے گزرتی سیلو کیب کو روکتے ہوئے وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی طرف بڑھ گئی۔

واصفہ حیدر سے اس کی دوستی اسکول جوائن کرنے کے چند دنوں بعد ہو گئی تھی۔ وہ
 بہت شوخ و چٹیل اور پیار کرنے والی لڑکی تھی۔ اس کا تعلق اعلیٰ فیملی سے تھا۔ وہ شوقیہ
 جاب کر رہی تھی۔ اسے گھومنے پھرنے کا کریز تھا اور اکثر کوشش کرتی تھی کہ خضرئی بھی
 اس کا ساتھ دے۔ مگر خضرئی بہت کم اس کا ساتھ دیتی تھی۔ کل وہ خود گھر جا کر اتانی سے
 اجازت لے آئی تھی۔ اتانی کی تو دلی خواہش تھی کہ خضرئی خوش رہے۔ لوگوں سے ملے،
 گھومے پھرے، زندگی کی ریگینوں کو محسوس کرے۔ انہوں نے بخوشی اجازت دی اور
 ساتھ ہی خضرئی سے چسپ کر کہہ دیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ رکھا کرے اور جہاں چاہے
 لے جایا کرے۔ انہیں اس پر اعتماد تھا۔

واصفہ نے پورا شاپنگ سینٹر کھنگالنے کے بعد پرنٹو، شرٹ اور دو شاعری کی بکس
 خریدی تھیں۔ گفت پیک کروا کر باہر آئیں تو اچھی خاصی موٹی موٹی بوندیں پڑ رہی
 تھیں۔

”واہ، بیوٹی فُل! کیا آفت موسم ہو رہا ہے۔“ اُس نے گھبراہٹ میں لیتے ہوئے

سے کرسی چھین کر بیٹھ گیا اور اس کے آگے سے کافی کامگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

”کر کے دکھاؤ کسی اور کو قتل۔ اپنی اور تمہاری جان ایک نہ کر دوں تو۔“

”اللہ رحم فرمائے میرے مستقبل پر۔ کس قدر بظلم ٹائپ وائف ملی ہے۔“

”وائف! دماغ درست ہے تمہارا۔ کیا بول رہے ہو؟“ وہ اتنی زور سے چیخی کہ اس پاس بیٹھے لوگ ادھر دیکھنے لگے۔

”سوری۔ میرا مطلب ہے فیوچر میں تو تم مری وائف ہو ہی نا۔“

”چلیں.....؟“ وہ بول رہی ہے۔ ”خضریٰ ان دونوں کو الجھا دیکھ کر گویا ہوئی۔“

”اوہ شٹ، دیکھو یہ بندہ ایسا ہی ہے۔ اس کی سوچو کی میں ہر شے فراموش ہو جاتی ہے بلکہ اس کی بک بک میں، میں تعارف کروانا ہی بھول گئی۔ یہ شہریار ہیں، میرے منگیتر۔“

”پلیز، اب تو میرا کچھ ادب کر لیا کرو۔ کس قدر بدتمیزی سے بول رہی ہو۔ آخر کار تمہارا ہونے والا سرتاج ہوں، عزت کیا کرو میری۔“ وہ جل کر بولا۔

”ہونے والے ہو..... ہوئے تو نہیں۔ جب ہو گے تو عزت بھی ہو جائے گی۔“

”آہ بڑے بے آبرو تیرے کوپے میں آکر ہم ہوئے۔“ خضریٰ سانس بھر کر اس نے شعر ترتیب دیا۔ واضح کھلکھلا کر سن پڑی۔ وہ ان دونوں کے درمیان ہونٹنی بیٹھی تھی۔

”شہری! ان سے ملو، یہ میری میسٹ فرینڈ ہے۔ خضریٰ..... خضریٰ حیات۔“

شہریار کو ایسا لگا جیسے اس کے دماغ میں دھماکا سا ہوا ہے۔ وہ آج کل اسی نام کے بھنڈور میں تو الجھا ہوا تھا۔ اس نے بے ساختہ نگاہیں اٹھا کر خضریٰ کی جانب دیکھا تھا۔

گلابی مائل سفید رنگت، ستواں ناک اور سحر انگیز چہرے کے نقوش، ڈارک براؤن چمکتی ہوئی آنکھوں پر گرقتی، انشتی، گھنٹیری پٹکوں کی بھالریں، متناسب سراپا اور سیاہ چادر میں لپٹا ہوا چہرہ بہت پُر وقار و پُر تقدس لگ رہا تھا۔

”کیا یہ وہی لڑکی ہے جس نے سائنزل جیسے سر پھرے کی زندگی بدل کر رکھ دی ہے؟“

کیا ضروری ہے یہ وہی لڑکی ہو؟ کیا اس نام کی واحد لڑکی اس پورے شہر میں ہے؟ لیکن

معلوم کر کہا۔

”تمہیں موسم کی خوبصورتی بھاری ہے ایڈیٹ! مجھے فکر ہو رہی ہے اگر بارش خیر ہو گئی تو کس طرح گھر جائیں گے؟ اس موسم میں رکشہ ٹیکسی والوں کے مزاج ویسے بھی آسان پر پہنچ جاتے ہیں۔“ خضریٰ پریشانی سے بولی تھی۔

”تیر کر بچھی جائیں گے، فکر نہ کرو۔“ اس نے فس کر کہا۔

”تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔“

”پہلے ”پیزا ہٹ“ سے چیز اور کافی پر ہاتھ صاف کریں گے۔ اگر ٹیکسی نہ بھی ملی تو بے فکر رہو، موٹارل ہے میرے پاس، گھر سے گاڑی منگوا لوں گی۔“ اسے پریشان دیکھ کر کہا۔

”میں کوئی کافی دانی نہیں پیوں گی۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ انا بی انتظار کر رہی ہوں گی اور شام کو بچے بھی آجائیں گے ٹیوشن پڑھنے۔“

”انا بی کو معلوم ہے کہ تم میرے ساتھ ہو اور تمہارے بچوں کے آنے سے قبل میں تمہیں ذرا پ کر دوں گی۔“ حسب عادت وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر پیزا ہٹ کی جانب بڑھ گئی۔

بات تو کچھ بھی نہیں تھی لیکن اس کا ایک دم

ہاتھ کو ہونٹوں پر رکھ کے روکنا اچھا لگا

چائے میں چینی ملانا اس گھڑی بجایا بہت

ذیر لب وہ مسکراتا شکر یہ اچھا لگا

اچھی آواز اور شوخ لہجے پر اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ قریب ہی بلیک پینٹ اور زردٹی شرٹ میں خاصا سارٹ نوجوان کھڑا بڑی مسکراتی نگاہوں سے کافی میں چینی ملائی

واصف کو دیکھ کر وہ شعر پڑھ رہا تھا۔

”اوہ، شہری! تم کیوں بچھا کر رہے ہو میرا؟“ وہ مصنوعی خشکی سے بولی۔

”کیا کروں؟ کسی اور کا بچھا کرنا ہوں تو تمہیں ہی اعتراض ہوتا ہے۔“ وہ بے تکلفی

”پلیز واصف! چلو، بچے ٹیوشن پڑھنے آگئے ہوں گے۔ بلا وجہ چھٹی ہو گئی تو اس طرح بچوں کے ذہن بھی خراب ہوں گے اور میری ریپوٹیشن بھی۔“ اس کا سوال قصداً نظر انداز کر کے وہ کھڑی ہو گئی۔ واصف کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑی۔

انہیں ڈراپ کرنے کی ذمہ داری اس نے لے لی اور خضرئی کے انکار کے باوجود اسے گھر ڈراپ کر کے گیا۔ اس میں اس کے دو مقاصد تھے۔ اول اس کا گھر دیکھنا اور دوم جلد ہی وہاں تنہا آکر شانزل کی کیفیت بیان کرنا اور ساتھ ہی یہ درخواست کرنا کہ وہ کسی طور شانزل کو سمجھائے کہ وہ اسے بھلا کر اپنی نئی زندگی شروع کرے۔

”کیسی لگی تمہیں میری دوست؟“ واصف نے مسکرا کر پوچھا۔

”ناگس۔ بہت کم گوارا بخیندہ ہے۔ تمہاری دوستی کیسے ہو گئی؟“

”تمہیں معلوم ہے نا بچے اور بڑے خلوص لوگ میری کمزوری ہیں۔ وہ بھی ایسی ہی ہے۔ میری ہم عمر مگر بے چاری کے ساتھ بہت بڑی ٹریجڈی ہو گئی ہے۔“ واصف کے لہجے میں افسردگی اور دکھ تھا۔

”کیسی ٹریجڈی؟ کیا ہوا ہے؟“

”چھ ماہ قبل ایک ایکسیڈنٹ میں اس کا ہسپتال ہلاک ہو گیا ہے۔“

”وہاٹ.....؟“ لہجے بھر کو اسٹیمزنگ اس کے ہاتھ سے بیکا تو کار بری طرح لہرا گئی۔

”رہ گئی۔ جب میں نے سنا تھا مجھے بھی اس قدر ہی افسوس ہوا تھا۔“

”میرا تو فریضہ سرت سے ہاتھ کا نپ اٹھا تھا مگر تمہ!“ اس نے دل میں سوچا۔

”پہلے تو میں اسے بچلے ہی سمجھتی تھی، جب اس نے بتایا تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ

بیوہ ہے اور کانی دنوں تک مجھے افسوس رہا۔ مگر ایک دن انانی نے اس کی ساری اسٹوری

سنائی تو میرے دل نے کہا کہ ایسے دھوکے باز اور لالچی شخص کا یہی انجام ہونا چاہیے

تھا۔“

”کیا بتایا تمہیں اس کی انانی نے؟“

واصف انانی کی زبان سے تمام حالات اُسے بتانے لگی۔

میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ اس کی سنجیدگی و محنت، سادہ و پُر وقار انداز، دلربا و معصوم حسن، دلکش و دلچسپ سرایا۔“

”میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔ جواب کیوں نہیں دے رہے؟“ واصف کی آواز نے اسے چونکایا۔

”کک..... کیا؟ کیا پوچھ رہی ہو؟“ وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”تم یہاں کیوں آئے؟ آئی میں تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟“

”اب تم اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا کہ تمہاری زلفوں کی مہکارت نے مجھے یہاں کا راستہ بتایا یا میرے دل نے تمہیں پکارا۔ بلکہ میں تو یہاں کافی پینے کے لئے آیا تھا، جب تم پر نظر پڑی تو ادھر چلا آیا۔“ وہ شرارت سے ہنس کر بولا تو واصف کا منہ بند ہو گیا۔

”کیسی ہیں آپ مس خضرئی! نہ معلوم کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔“ وہ براہ راست خضرئی سے مخاطب ہوا اور ہاتھ بنا کر بولا۔

”جی ہاں۔ یہ ان کی بہت پرانی بیماری ہے بلکہ لا علاج بیماری ہے کہ ہر حسین چہرے کو دیکھ کر انہیں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔“ واصف نے فوراً بدلہ لیا تھا۔

”اچھا۔“ اس نے آہستگی سے مختصر جواب دیا۔

”پھر تو آپ کو جگہ بھی یاد ہوگی جہاں آپ نے انہیں دیکھا تھا۔“ واصف کو بھی اسے چہانے میں سرور محسوس ہو رہا تھا۔ جبکہ نادانستگی میں وہ اس کی انجھن سلجھا رہی تھی۔

”ہوں، شاید۔ میں نے خضرئی جی کو کچھ عرصے قبل شانزل گروپ آف انڈسٹریز کی ایک برانچ میں دیکھا تھا۔“ اس نے گہری کھوجتی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور اس نام پر اس کے پرسکون چہرے پر پھلتے رنگ دیکھ کر اسے اپنے گمان پر یقین ہونے لگا۔

”جی ہاں۔ میں وہاں جاب کرتی تھی مگر اپنے کام سے کام رکھتی تھی، اس لئے شاید آپ کو نہ دیکھ پائی۔“ اس کے لہجے میں اضطراب اور گھبراہٹ تھی۔

”ارے وہ تو بہت ہیٹ جاب تھی۔ کیوں چھوڑ دی آپ نے؟“

”سچ، وہ لڑکی بہت مظلوم اور شریف ہے۔“ شاہ زیب صاحب اُس کی زبانی خضرئی کے متعلق جان کر سخت افسردہ ہوئے تھے۔ واصفہ کی زبانی اس کے حالات سن کر وہ اسے ڈراپ کر کے رکھا نہیں تھا سیدھا ان کے آفس چلا آیا تھا۔

شانزل سے پہلے اس نے انکل سے بات کرنا مناسب سمجھی تھی جس کا انہوں نے مگر جوشی سے مثبت جواب دیا تھا۔

”کبھی سنا تھا بہترین دوست اللہ کی بڑی رحمت ہے۔ آج تم نے یہ بات سچ کر دکھائی۔ تمہاری بے غرض اور پُر خلوص دوستی اور محبت نے اپنے دوست کو جینے کی راہ دکھائی ہے۔ پراؤڈ آف مائی سن!“ انہوں نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

شہریار نے اس کٹھن وقت میں ان کا دل و جان سے ساتھ دے کر ثابت کر دیا تھا کہ اس کی دوستی بے مثال و قابلِ فخر و ستائش ہے۔

ادھر اس نے ان کے آنسو پونچھے تھے تو ادھر شانزل کو کمرے سے کھینچ لایا تھا۔ چاہے وقتی طور پر یا محض دکھاوے کے لئے ہی سہی، وہ گوشہ نشینی سے باہر نکل کر بزنس میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس کے ساتھ بھی کافی وقت گزارنے لگا تھا۔

”آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ جو کچھ میں کر رہا ہوں، آپ کی اور شانزل کی محبت کے آگے وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بتائیں وہاں کب چلیں گے؟“ وہ ان سے علیحدہ ہو کر بولا۔

”جب آپ مناسب سمجھیں۔ اگر ابھی کہیں تو ابھی چلتے ہیں۔“

”انکل! کیا آپ صدقِ دل سے خضرئی کو بہو بنا کر لائیں گے یا محض بیٹے کی نگاہوں میں اپنی پریشی بڑھانے کے لئے اسے وقتی طور پر لے آئیں گے تاکہ عام باحیثیت لوگوں کی طرح بعد میں اس غریب لڑکی کو منظر سے آؤٹ کر کے اپنی حیثیت کی بہو لے کر آئیں؟“

”اللہ گواہ ہے، میرے دل میں ایسی کوئی گھٹاؤنی سازش نہیں ہے۔ بلکہ میں اب سمجھا

ہوں کہ اس گھر کو ایک مخلص و باوقار بیوی اور بیٹی کی ضرورت ہے۔ یہ فرائض صرف ایک تہذیب یافتہ ملل کلاس لڑکی ہی نبھا سکتی ہے۔ ہماری کلاس کی لڑکیاں گھر اور گھرداری سنبھالنے اور رشتے ناتوں کو سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتیں۔“

”آپ نے مانتے نہیں کیا ہوگا انکل! میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ لڑکی خضرئی شانزل کے بارے میں اچھی رائے اور اچھے خیالات نہیں رکھتی۔ پہلے میں واصفہ کے ذریعے ان کی بزرگ گارجین انا بی سے گفتگو کر کے انہیں راضی کروں گا، اس کے بعد آپ کو لے کر چلوں گا۔ بلکہ ہم پریوزل لے کر جائیں گے۔“ اس نے پُر عزم لہجے میں کہا پھر چونک کر بولا۔ ”انکل! ابھی یہ ساری کارروائیاں شانزل سے سیکرٹ رکھی جائیں گی۔ جب سب معاملات طے ہو جائیں گے تو بالکل عین موقع پر ہم اسے سر پرانز دیں گے۔“

”ارے میاں! یہ تو وہی بات ہوئی کہ کنوئیں سے بچے تو کھائی آگے آگئی۔ جس شخص کو میری بیٹی چند ماہ برداشت نہ کر سکی اس شخص کے ساتھ ساری زندگی کس طرح گزار سکتی ہے؟ اور پھر آدمی بھی بدکردار اور بد چلن۔ نہ بابا، محاف کرو۔ کم از کم اس چیونٹیوں بھرے کباب سے میری بیٹی کو دور رکھو تو بہتر ہے۔ لو بھلا، ایک خدا بے چسپی تھی کہ پھر۔“

”معزز خاتون! خدا را میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ شانزل خان اب بالکل بدل گیا ہے اور اسے بدلنے میں خضرئی کی خوش نصیبی شامل رہی ہے۔“ شہریار ان کی بات قطع کر کے عاجزی سے گویا ہوا۔ واصفہ نے ساری بات سن کر مشورہ دیا تھا کہ وہ انا بی کو راضی کر لے تو خضرئی کو راضی وہ خود کر لیں گی۔ سو آج وہ اس وقت ان کے روبرو تھا اور دلائل کے ذریعے انہیں قائل کرنے کی سعی میں مصروف تھا۔

”میری دعا ہے اللہ اسے اور ہدایت نصیب کرے، اسے اچھا اور بکا مسلمان بنائے۔ بس اس سے زیادہ ہم اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔“ وہ پلنگ سے اٹھتے ہوئے نروٹھے

”تمہارے پاس، شانزل خان سے۔“ وہ اُس کی جانب بخورد بکھتی ہوئی بولیں۔

”واہ!..... کون آیا تھا؟“ اُس کے جسم میں گویا چکاریاں چٹ گئی تھیں۔

”اُس کا دوست۔ شہر یار نام بتایا تھا اس نے۔“

”اُس ذلیل کیسے شخص کی یہ ہمت..... آپ نے بے عزت کر کے نکالا ہوتا اُسے۔“

”وہ کہہ رہا تھا، وہ تمہارا پاس بالکل سدھر گیا ہے۔ شریعت زندگی گزار رہا ہے۔“

”مجھے کچھ نہیں سننا اس شخص کے بارے میں۔ اب کوئی آئے تو دھکے دے کر نکال دے۔“

گامیہاں سے۔ اذہد..... کیا سمجھتا ہے خود کو۔“ غصے سے اس کا برا حال تھا۔

بھڑبھڑ

”میں چلوں گا تمہارے ساتھ بیٹے! اور انہیں راضی کر کے ہی آؤں گا۔“ شہر یار سے

تمام صورت سن کر وہ پریشان لہجہ میں بولے۔

”بڑے صاحب..... بڑے صاحب! دیکھئے بھونے صاحب آنکھیں نہیں کھول

رہے اور بخار بہت تیز ہے۔“ اسی دم عارفین اندر سے دوڑا ہوا آیا اور بدحواسی سے بولا تو

شاہ زریب صاحب اور شہر یار دونوں ہی آگے پیچھے اُس کے بندروم کی طرف بڑھے تھے

جہاں بیڈ پر وہ بے سدھ پڑا تھا۔

”شان!..... شان!“ شاہ زریب صاحب بے قراری سے اس پر جھکے پکار رہے تھے۔

اس کی بیوشی محض ایک بہانہ ثابت ہوئی۔ وہ بستر سے پر اٹھائی نہیں۔ اُس کی سرخ

و سپید رنگت چند محنتوں میں ہی زرد ہو گئی۔ چہرے کی شادابی و تازگی کم ہو گئی۔ شاہ زریب

صاحب ہر وقت اس کے سر ہانے موجود رہتے۔ انہیں اپنی اور برفس کی بھی پروا نہیں

تھی۔ وہ ہسپتال میں ایڈمٹ تھا۔ اُس کا مکمل چیک اپ ہوا۔ کئی ٹیسٹ ہوئے۔ آخر کار

اُس کی ماضی کی کثرت شراب نوشی و سگریٹ نوشی نے اثر دکھایا تھا۔ ڈاکٹرز کے بورڈ نے

یہ جان لیوا خبر سنا دی کہ وہ پچھیردوں کے خار سے میں مبتلا ہو چکا ہے۔ یہ خبر ان پر بجلی

بن کر گری تھی اور وہ اندر سے بالکل ہی ڈھسے گئے تھے۔

”جو صلی سے کام لیں اٹکل! آپ تو بہت ہمت اور حوصلے والے ہیں۔“

پن سے بولیں۔“

”ٹھیک ہے، میں آپ کا مزید وقت نہیں لوں گا۔ صرف میری چند باتیں سن لیجئے۔“

خضر کی کے سر پر باپ اور بھائی کا تحفظ نہ تھا تو اس کی زندگی کتنی کٹھنائیوں سے گزری،

شانزل بھی بچپن سے ماں اور بہن جیسے رشتوں کے مقدس آئینل سے محروم رہا تو کروڑ

میں جھول آ گیا جس میں زیادہ تعلق اس کے ماحول اور بھائی کا تھا۔

خاندان نہ ہو تو عورت ماں اور باپ دونوں کا فرض نبھا دیتی ہے مگر مرد یہ ذمہ داریاں

بھر پور طریقے سے نہیں نبھا سکتا۔ وہ صرف باپ کا ہی رول پلے کر سکتا ہے۔ شانزل نے

برائی اور گناہ کی راہیں چھوڑ کر نیکی اور اچھائی کی راہ پر چلنے کا عزم کیا ہے اور آپ کو معلوم

ہو گا کہ بندے برائی کی جانب جلد راغب ہو جاتے ہیں یہ نسبت نیکی و اچھائی کی راہ پر

چلنے کے۔ اگر کوئی شخص و ہمدرد محبت کرنے والی ہستی کی رہنمائی اور ساتھ مل جائے تو

ڈگمگماتے قدم مضبوط ہو جاتے ہیں۔ کسی بھولے بھٹکے کو نیک راہ پر چلانا کتنے ثواب و نیکی

کا کام ہے، یہ آپ بہتر جانتی ہیں۔ ابھی تو میں جا رہا ہوں لیکن گل آپ کا جواب سننے

ضرور آؤں گا۔ آپ فیصلہ کر لیجئے گا کہ کسی کو پُر غلوں، سہارا دے کر اپنی آخرت سنوارنے

کا نیک کام کریں گی یا اسے دوبارہ گناہوں کی دلدل میں غرق ہونے کے لئے بے

احتیاطی برقیں گی۔“

وہ رکائیں اور انہیں گولگی کیفیت میں چھوڑ کر چلا گیا۔

نیکی اور ثواب کے نام پر ان کے اندر پلٹل سی جھجک تھی اور یہ کشش ان کے اندر

پھیلنے ہی چلی گئی اور یہ کیفیت خضر کی سے بخلی نہ رہ سکی۔

”کیا بات ہے انا بی؟ جب سے اسکول سے آئی ہوں آپ کو پریشان دیکھ رہی

ہوں۔“ وہ ان کے قریب بیٹھ کر استفسار کرنے لگی۔

”رشتہ آیا ہے تمہارا۔“ انہوں نے چھپاتا فضول سمجھا کہ وہ کل بھی آنے کو کہہ گیا تھا

اور کب تک وہ اس سے اس موضوع پر بات نہ کرتیں۔

”رشتہ؟ کہاں سے؟“ وہ بے ساختہ ہنس کر گویا ہوئی۔

”جوان بیٹے کو موت کی طرف بڑھتے دیکھ کر میرے تمام حوصلے ٹوٹ گئے ہیں، میں کیا کروں؟ کہاں سے درد و تکلیف سے تڑپتے بیٹے کو دیکھنے کا حوصلہ لاؤں؟“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔

”پلیز، خود کو سنبھالیے۔ اگر شانزل آپ کو اس طرح دیکھ لے تو کیا ڈکھی نہیں ہو گا؟“ شہر یار اپنے آنسو بمشکل ضبط کرتا بھرائی آواز میں انہیں دلا سے دینے لگا۔

”سرا دروم میں آپ کو شانزل صاحب بلا رہے ہیں۔“ معائنہ نے آکر اطلاع دی۔
 ”آپ جاؤ بیٹا! میں کچھ دیر میں منہ دھو کر آ رہا ہوں۔“ وہ تیزی سے رومال سے بیگ چہرہ صاف کرتے ہوئے بولے تو وہ پرائیویٹ روزمر کی طرف چل پڑا۔

”تھک آگئے تا میری تھار داری سے۔ اس لئے کہتا ہوں گھر بھی چلے جایا کرو۔“ اُسے اندر آتے دیکھ کر شانزل جو کچھ کے سہارے نیم دراز تھا، مسکرا کر بولا۔

”میں چلا جاؤں اور تم خوب بد پرہیزی کرو۔“ شہر یار چیمبر پر بیٹھ کر بولا۔
 ”اب کیا بد پرہیزی اور کیا پرہیز، دن ہی کتنے ہیں یار۔ اب تو نہ ٹوک مجھے۔“ وہ ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو شہر یار بری طرح چونک پڑا۔

”کیا..... کیا مطلب؟“ وہ بری طرح شیشا کر گیا ہوا۔

”میں کوئی چپہ نہیں ہوں جو کچھ نہ سکوں کہ مجھے جو ٹریسٹ دی جا رہی ہے، وہ کس جوتیشن میں دی جاتی ہے اور رپورٹس فائل کو میں تمہاری غیر موجودگی میں اسٹڈی کر چکا ہوں۔“ اُس کا لہجہ نارمل تھا جیسے بہت پہلے وہ اس حقیقت سے روشناس ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی نگاہوں میں کئی ٹوٹے ستاروں کی کرچیاں تھیں۔ کوئی محرومی، کوئی خلش، کوئی ملال درد میں کران کرچیوں سے تھک رہا تھا۔

شہر یار جس نے خود پر ضبط کے پیرے لگائے تھے، اس پر سکون چہرے کی متوجہ، بے قرار آنکھوں کا درد اُس کے دل کا درد میں کراٹھا تھا۔ وہ اس سے لپٹ کر بری طرح رو دیا۔

”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ پلیز خود کو سنبھالو۔ اگر تم بہت کچھ

دو گے تو ڈیڈی کو کون سنبھالے گا؟ میرے بعد تم کو ہی۔“

”خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔ نہیں کرو ایسی باتیں۔ کچھ نہیں ہو گا تمہیں۔ کچھ نہیں ہو گا۔ بیماری کتنی ہی خطرناک ہو مگر وہ انسانی دل پاؤں سے زیادہ ستر و جگ نہیں ہوتی میری جان۔ تم میں بھرپور اسٹیمنا ہے، غضب کی قوت مدافعت رکھتے ہو۔“

”چھوڑ دو ان باتوں کو۔ جس کا ہنسا وقت لکھا ہوتا ہے وہی سانس اُسے گزارتی ہوتی ہیں۔ میں تو بہت گناہ گار بندہ ہوں۔ عمر کا ہر بل بے خبری اور فحش میں گزارا ہے، اب تو شاید توبہ بھی قبول نہیں ہوگی میری۔“

”نہیں کرو۔۔۔ نہیں کرو ایسی بھیا نک باتیں۔ اللہ کے کرم سے نا امید نہ ہو۔ انگل نے امریکہ میں کئی اسپیشلسٹ کے پاس تمہاری رپورٹس بھیجی ہیں۔ ان کا آج جواب آ جائے گا تو انگل تمہیں علاج کے لئے وہاں لے جائیں گے۔ بہر حال وہاں ہمارے مقابلے میں آسانیاں زیادہ ہیں۔“

”سنو۔۔۔ موت مقدر میں گئی تو سمجھو بن گئی۔ دنیا کا کوئی ملک موت سے نہیں بچا سکتا۔ ایک زندگی میں نے اپنے وطن سے دور گزاری ہے۔ مرنے میں اپنے وطن میں ہی چاہوں گا۔“ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”تم اتنے کھوڑ کیوں بن گئے ہو؟ کیا تمہیں ہماری محبتوں کا ذرا بھی احساس نہیں؟“ ”بہت ہے۔ لیکن ڈیڈی سے کہہ دینا میں علاج کی خاطر کہیں نہیں جاؤں گا۔“ کمرے میں ویز آداسی پھیل گئی تھی۔ کسمیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

شانزل آنکھوں پر بازو رکھے خاموش لیٹا تھا۔ نا معلوم اس وقت اُس کے کیا جذبات تھے۔ شہر یار کو اُس کی غیر معمولی خاموشی سے وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ پکارا اٹھا۔
 ”شانی۔۔۔ شانی۔۔۔ شانزل!“ وہ گھبرا کر متوجہ انداز میں اس پر جھکا۔

”زندہ ہوں۔ اتنی جلدی مرنے والا نہیں ہوں یار۔“ وہ آنکھوں سے ہارو ہٹا کر مسکرا کر گویا ہوا۔

”ٹٹ اپ، کوئی حق نہیں پہنچتا تمہیں اس طرح ہمارے جذبات کو ٹیڑھ کرنے کا۔“

”مجھے اعتراف ہے یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ لیکن اگر گھر میں کوئی بہن یا ماں ہوتی تو وہ ہرگز نہ بگڑتا۔ گھر کی تہائیوں سے گھبرا کر اس نے کلب جانا شروع کیا اور میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ وہ اب باشعور اور مجتہد ہو گیا ہے اور میں بڑس میں گمن ہو گیا۔ پھر جان بوجھ کر میں سب کچھ نظر انداز کرتا رہا کہ یہ سب تو جوانی کے شغل ہیں، خود بھی وقت آنے پر چھوٹ جائیں گے۔ مگر ایسا ہو جائے گا، مجھے معلوم نہ تھا۔“

”روپیہ ہر برائی کی جڑ ہے۔ اور پھر ان لوگوں کا تو کوئی دین ایمان ہی نہیں رہتا جو غیر ملکوں میں دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے کے جنون میں مذہب کے حقوق، شریعت کے فرائض سب بھول کر مسلمان ہو کر بھی غیر مسلموں کے طور طریقے اپنا لیتے ہیں۔ آج آپ اس دولت کو ایک غیر لڑکی کے نام کر دینے کو تیار ہیں جس دولت کو پانے کے لئے آپ نے اپنے مذہب سے خود کو بھی دور رکھا اور بیٹے کو بھی محروم رکھا اور آج آپ پھر بھی خالی ہاتھ ہیں۔ سونے کے گل، بیروں کی چمک، کچھ بھی آپ کے کام نہیں آ رہی۔ دنیا میں آپ اتنے تکی دست ہیں تو آخرت میں کیا ہوگا؟“

”میں شرمندہ ہوں، پشیمان ہوں اپنے رب سے۔ میں نے توبہ کر لی ہے اور ساتھ ہی اس کی رشتی کو مضبوطی سے پکڑنے کا عہد بھی کر چکا ہوں۔ کیا میرے جاں یہ لب بیٹے کی خطائیں خضرئی بنی معاف نہیں کر سکتی؟“ وہ یاسیت بھرے لہجے میں بولے۔

”میں کوشش کروں گی بھائی صاحب کہ کسی طور وہ مان جائے۔“ انابی دلچسپی سے لہجے میں بولیں تو وہ اٹھ کر شکستہ قدموں سے گھر کی دہلیز پار کر گئے۔

”اب جو ہوتا تھا، وہ ہو چکا بنی۔ جب کوئی خطا کار اپنی غلطی مان لے، سچے دل سے توبہ کر لے تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ ہم تو خود خطا کار اور گناہگار بندے ہیں پھر بھلا ہماری کیا اوقات کہ ہم کسی کو معاف نہ کر سکیں۔ سب بھلا دو میری بچی۔ ہاتھ تمام لو اس بچے کا جو خود اپنے ہاتھوں موت کی دہلیز پر پاؤں رکھ چکا ہے۔“ انابی نے شاہ زیب صاحب کے جانے کے بعد اندر کمرے میں بیٹھی سب سنی ہوئی خضرئی کو جا کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

اس کی جھنجھلاہٹ پر شانزل نے قہقہہ لگایا تھا مگر درد کی تیز لہر میں قہقہہ دب کر رہ گیا۔

”بہن تم! اللہ کے بعد میرے بیٹے کی زندگی آپ کی بیٹی کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کے واسطے میرے بیٹے کی زندگی بچالیں۔ اس پر رحم کھائیں۔ میں خضرئی بیٹی کے نام اپنی تمام دولت و جائیداد لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔ صرف وہ مجھے میری اصل دولت لوٹا دے۔ اس کی ایک ہاں میرے بیٹے کو واپس پلٹنے پر مجبور کر دے گی۔ وہ ایک نہیں، دو زندگیاں بچا لے گی۔ میں تاحیات اس کا مشکور رہوں گا۔ تمام عمر اسے شہزادی بنا کر رکھوں گا۔ اس پر اس کی حکمرانی ہوگی۔“

وہ دولت مند سینہ جس کی حیثیت و امارت کا ایک جہاں میں ڈنکا بجاتا تھا، آج تیسری مرتبہ اس معمولی، جگہ جگہ سے ادھڑے فرش والے گھر میں اپنی تمام حیثیت و مرتبہ بھلائے بیٹھا اپنے بیٹے کی زندگی کی بیک مالنگ رہا تھا جس کے سروٹ کو اڑھائی اس جگہ سے بہترین وقت تھی مگر اپنے بیٹے میں لگی آگ کے آگے اسے یہ بے حیثیت گھر دنیا کی واحد جائے پناہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کسی بے کس و مجبور کی طرح اس کی منت و سماجت کر رہے تھے اور آج پوری شدت سے انابی کو ان کا درد، تکلیف اور ذمہ محسوس ہو رہا تھا۔

”بھائی صاحب! شرمندہ نہ کیجئے۔ اللہ آپ کے بیٹے کو ہزاروں سال زندہ رکھے۔ ہم تو بہت ہی بے حیثیت اور غریب لوگ ہیں۔ محل میں ٹاٹ کا بیوند بھی نہیں جتنا۔ یہ دنیا ایک کھیت کی مانند ہے۔ یہاں جو انسان یوتا ہے، وہی کل کا ٹٹا ہے۔ آپ کے بیٹے کی حالت، اس کی بیماری، اس کی لاپرواہی اور بھرمانہ غفلت کا شاخسانہ ہے۔ لڑکا ہوا لڑکی، جب وہ سن بلوغت کو پہنچ جائیں تو قدم قدم پر ان کی نگرانی اور رہنمائی کرنی چاہئے۔ مگر آپ جیسے دولت والے ان باتوں کو فرسودگی اور جہالت گردانتے ہیں اور وقت آنے پر اسی طرح سر پر ہاتھ رکھ کر دیتے ہیں۔“

خضرؑ نے کچھ کہا نہیں۔ گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ انہیں خود ہی اس پر پیار آ گیا تو کچھ توقف کے بعد اس کے قریب بیٹھ کر گویا ہوئیں۔

”تم نے خود ہی تو مجھے سب کچھ بتایا۔ حتیٰ کہ گاؤں جانے والی بات بھی کچھ غرصہ چھپانے کے بعد بتادی۔ ہمارا رشتہ ہی ایسا ہے کہ ہم اگر ایک دوسرے سے کوئی بات چھپانا چاہیں تب بھی نہیں چھپا سکتے۔ خود سوچو اگر وہ فطرتاً عیاش ہوتا تو اسے تو بار بار ایسے مواقع ملے ہتھے کہ وہ اپنی من مانی کر سکتا تھا۔ مگر تم نے خود بتایا کہ سوائے ذمہ داری باتوں کے اس نے کوئی نامزد یا حرکت نہیں کی بلکہ بہت عزت و احترام سے پیش آتا رہا۔ تو بات صاف ہوئی کہ وہ ایسا نہیں ہے جیسا تم سمجھتی رہی ہو۔ دیکھو بیٹی! معاف کر دو اسے اور اُس کا ہاتھ تھام کر اپنی ماں کی تربیت کی لاج رکھ لو۔ مجھے یقین ہے اس بار اللہ تم پر اپنی رحمت کی برسات ضرور کرے گا۔“ انہوں نے التجائیہ لہجے میں کہا تو ان کے شانے پر سر رکھتے ہوئے کئی آنسو ایک ساتھ چھٹک پڑے تھے۔

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

بیٹھے رہیں تصورِ جاں کے ہوئے

”تمہاری آواز سے اچھی تو یہ کڑوی دوائیاں ہی ٹھیک ہیں۔“

”وہ کیا کہتے ہیں، مگر کارِ فدا دل برابر۔ تو میری مثال کچھ یونہی ہے۔“

”ارے نہیں بھئی، میرے بیٹے کی آواز تو بہت پیاری ہے۔“ شاہ زبیب صاحب

اعتر آتے ہوئے خوش دلی سے بولے تو شہر یار نے اکڑ کر شانزل کی جانب دیکھا تھا۔

”طبیعت کیسی ہے مائی سن؟“ وہ شانزل کے قریب بیٹھ کر پوچھنے لگے۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک۔ آپ بہت کمزور ہو رہے ہیں۔“ اُس نے ڈکھی نگاہوں سے

ان کی جانب دیکھا۔ وہ جو باپ کے بجائے اس کے بڑے بھائی لگا کرتے تھے، ان دو

ڈھائی ماہ میں ایک دم ہی نڈھال اور بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔ اس کا دل تڑپ اٹھا۔

”اپنا خیال رکھا کریں ڈیڑی ایہ کیا حالت بنالی ہے آپ نے اپنی؟“

”ہرگز نہیں انا بی۔ پہلے میں نے آپ کے اور امی کے سامنے سر جھکا دیا تھا مگر اب میں ایسا کوئی فیصلہ نہیں سنوں گی۔ اس شخص کا ساتھ تو مجھے بالکل گوارا نہیں ہے۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

”اللہ کے قہر و غضب سے ڈر۔ مت کسی مجبور و پریشان کا امتحان لے۔ وہ کروڑ پتی آدمی صبح شام ہماری ویلیر پر آتا ہے کسی بھکاری کی طرح فریاد کرتا ہوا۔ کتنا سخت وقت اس پر آیا ہے۔ مجھے خوف آتا ہے تمہاری یہ ہٹ دھرمی ہمیں کسی مصیبت میں مبتلا نہ کر دے۔ مان جا بیٹی! حیرا ساتھ اسے خوشیوں کی طرف، زندگی کی طرف لوٹا دے تو کیسا ثواب کا کام ہوگا۔ اور پھر خود سوچو۔ تم اس طرح کب تک تنہا زندگی گزارو گی؟ میرا ساتھ تو بہت ناتوان اور بڑا ہے۔ عمر گزار چکی ہوں۔ کبھی بھی سانس کی ڈوری کٹ سکتی ہے۔“

”کسی کی خاطر آپ خود کو مت کوئیں انا بی۔“

”میں سچ بیان کر رہی ہوں بیٹی! زندگی بڑی دعا باز ہوتی ہے۔ کب دعا دے جائے کسی کو معلوم نہیں۔ کوئی بھی انسان ماں کے پیٹ سے چورہ ڈانگہ آوارہ، بدکردار پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ حالات اسے اپنے سامنے جس ڈھالتے ہیں۔ شانزل کو بگاڑنے میں بھی یہی حالات تھے۔ اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے سر پر ماں کا سایہ نہ تھا اس لئے وہ اس قدر بگڑ گیا۔ مگر دیکھو جب اس نے اصل جیا اور عورت کا وقار دیکھا تو اس نے توبہ کر لی۔ اسیر ہو گیا تمہارا۔ پابند کر لیا خود کو تمہارے لئے۔“

”یہ سب اپنی جگہ درست ہے۔ مگر میرا دل نہیں مانتا۔“

”اوپنہ۔۔۔۔۔۔ مانتی رہو اپنے دل کی۔ جب قت گزر جائے گا تو سمجھتا دے وہ جائیں

مگر۔ اور یہ بات گرہ میں باندھ لو، تمہا عورت معاشرے میں سہولت سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور لی، تم بیوہ ہو، بے شک از دوامی زندگی کا ایک لمحہ بھی تم نے نہیں گزارا۔ مگر لوگ جانتے ہیں کہ تم بیوہ ہو۔ اگر بھولے بھٹکے کسی نے اپنانے کی خواہش ظاہر بھی کی تو وہ کوئی رشتہ دار ہوگا یا دوسری شادی کا کوئی شوقین یا پھر کوئی نشہ باز۔ کسی اچھے گھرانے سے رشتہ آنے کا تو تصور بھی نہیں ہے۔“ اُس کے مسلسل انکار نے انہیں مشتعل کر ڈالا تھا۔

”سوچا تھا جتنا جوان ہو جائے گا تو باپ کا خیال رکھے گا۔ مگر بچے کو تو لہنا بھی خیال نہیں۔“

”ڈیڈی۔ ڈیڈی! آپ رو رہے ہیں؟“ اُن کے آنسو اس سے برداشت نہیں ہوئے۔

”نہیں ہے مجھ میں طاقت جوان بچے کو تکلیف سے تڑپے دیکھنے کی۔ تم امریکہ جانے کی حامی کیوں نہیں بھرتے؟ کیوں مجھے کند چھری سے ذبح کر رہے ہو؟“

”مان جاؤ انگل کی بات۔ کیوں مزادے رہے ہو اپنے ساتھ ان کو بھی۔“ شہریار نے ہچکے لیچے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔“ وہ طویل سانس لے کر گویا ہوا۔

”ساتھ ایک شرط اور بھی ہے۔“

”جی فرمائیے؟“

”تمہیں شادی کر کے بیوی کو ساتھ لے کر جانا ہوگا۔“

”ڈیڈی!..... آپ مذاق کر رہے ہیں؟“

”نہیں۔ یہ تمہاری بہتری کے لئے ہے۔ شام کو تمہارا نکاح ہے اور کل فلائٹ سے تم اپنی بیوی کے ساتھ امریکہ علاج کے لئے روانہ ہو جاؤ گے۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں ڈیڈی آپ؟ میں مرتے ہوئے کسی کی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتا۔“

”ایک بار لڑکی سے قول لو، پھر کچھ کہنا۔“ اور اس کے بولنے سے قبل وہ دونوں کمرے سے نکل گئے اور وہ غصے سے ہونٹ جھینپے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

اُس نے بے حد جھنجکتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ وہ سامنے بیڈ پر سفید براق بستر پر نہ جانے سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ زرد چہرے، بکھرے بالوں اور بے حد کمزور جسم والا یہ وہ شانزل تو نہیں تھا جس کی سرخ و سپید رنگت، بھرپور وجاہت اور اسٹائش کی لڑکیاں دیوانی تھیں۔

ان تین ماہ کے عرصے میں تو وہ بے حد بدل گیا تھا۔ وہ بے دھیانی میں آگے بڑھی تو کرسی سے ٹکرائی۔ آہٹ پر شانزل نے آنکھیں کھولیں تو چائے میں خواب کا گمان ہوا۔

حقیقت تھی یا خواب.....؟

وہ سامنے تھی۔ ہر آہٹ پر جس ستم گر کے آنے کا گمان ہوتا تھا۔

”السلام علیکم۔ کیسے ہیں آپ؟“ اُس کی ایک نکل گھورتی نگاہوں سے گھبرا کر وہ بول اٹھی۔

”یہ خواب نہیں، یہ وہی ہے۔ وہ جس کے تصور سے جسم کا سارا لہو، دل کی ساری دھڑکنیں، جذلوں کی ساری جدتیں، روح کی ساری لطافتیں، میری تمام سوچیں، قلب کی ساری خواہشیں جس کے ہیکل سے منسوب تھیں۔ اس تمام عرصے میں وہ میرا خشک بن گئی تھی جس کا تصور میری نگاہوں میں بس گیا تھا۔ اس سے میرا وہی تعلق تھا جو جسم کا روح سے ہوتا ہے۔“

”کیسے ہیں آپ؟“ اُس کی وارفتہ نگاہوں اور محویت نے اُسے پزل کر ڈالا تھا۔

”تم بن احوار، بالکل بے روح وجود کی مانند۔ میں نے تمہیں چاہئے کا گناہ کیا ہے۔ مگر یقین کرو محبت اختیار ہی جذبہ ہوتی تو میں خود کو روک لیتا لیکن میں بالکل بے بس و مجبور ہو گیا۔ تمہیں دیکھا، سب سے الگ، بالکل انوکھی شخصیت لگی تمہاری۔ جلد ہی میں محسوس کرنے لگا تم وہی ہو جس کی مجھ کو تلاش تھی، جس کی میرے دل کو ضرورت تھی۔ وہ باتیں، وہ حرکتیں میں جان بوجھ کر کرتا تھا تاکہ تم مجھ سے بدظن ہو کر دور چلی جاؤ۔“

شدت تکلیف سے وہ لمبے بھر میں پسینے پسینے ہو گیا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے آپ کو؟ میں ڈاکٹر کو بلائی ہوں۔“ اُس کی بگڑتی حالت دیکھ کر وہ گھبرا کر بولی مگر اس نے منع کر ڈالا۔

”نہیں۔ پہلے میری بات سنو۔ تم نے میری ساری گستاخوں کو بچے دل سے معاف کر دیا نا؟“

”ہاں..... اور میں آپ کے ساتھ زیست کا سفر طے کرنے کو تیار ہوں۔“

”محبت خود غرض نہیں ہوتی خضرئی! اب کچھ باقی نہیں بچا۔ میں تمہاری زندگی خراب کرنا نہیں چاہتا۔ تمہیں پانا میری خواہش تھی جو حسرت بن گئی۔“

”نہیں شانزل، آپ کو میری خاطر پلٹنا ہے۔ میں نے زندگی میں کوئی خوشی نہیں پائی۔ مگر اب میں خوشیوں سے دستبردار نہیں ہوں گی اور آپ کو بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔“ وہ اس کے ہاتھ کو آنکھوں سے لگا کر رو دی تو اس کی سچی محبت اور چاہت پا کر شانزل کو اپنے مردہ وجود میں نئی حیات کی توانائیاں از سر نو بیدار ہوتی محسوس ہوئیں اور بیماری کو قوت مدافعت و ہمت سے زیر کرنے کی انگلیں توانا ہو گئی تھیں۔

”ارے..... ارے بھابھی جان! اب دلہنیں ہنستی مسکراتی وداع ہوتی ہیں۔“ اسی دم شہریار اندر آ کر بولا تو سٹپٹا کر اس نے شانزل کا ہاتھ چھوڑا تھا۔

”انکل! مت کیجئے گا اس کی شادی۔ انکار کر رہا ہے۔“

”نہیں..... نہیں۔ ڈیڈی کی بات میں نے کبھی نہیں ٹالی۔ اب بھی ماننے کو تیار ہوں۔“ وہ شوخی سے بولا تو شہریار ہنس پڑا تھا۔ خضرئی ڈاکٹر کو بلانے کمرے سے نکل گئی اور بیٹے کی آنکھوں میں خضرئی کا عکس دیکھ کر اب وہ مطمئن تھے کہ ان کا بیٹا کچھ تکلیف دہ مراحل سے گزر کر صحت مند زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔ بخوبی واقف تھے کہ شانزل اپنی پسندیدہ شے حاصل کر کے ہی سکون حاصل کرتا ہے۔

(ختم شد)